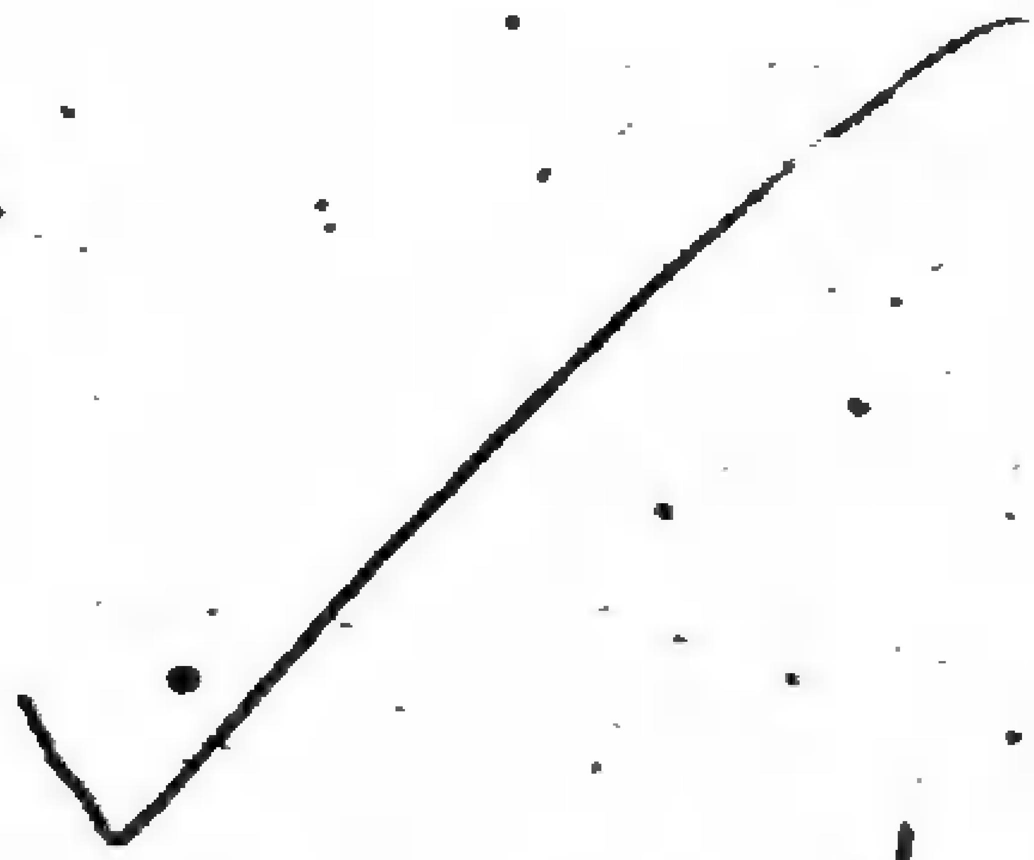
# خطبۂ تبوک

(حضور صلی اللہ علیہ و سلم کا خطبہ مبارک
بمقام تبوک ۔ غزوۂ تبوک رجب ۹ھ)

ترجمہ از
سید عبد القدوس ہاشمی

---

ادارہ تحقیقات اسلامی
اسلام آباد



# خطبۂ تبوک

اہل سیر کی اصطلاح میں غزوہ اس فوجی سہم کو کہتے ہیں جس میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکت فرمائی تھی، اور سریہ ان سہمات کو کہا جاتا ہے جن میں خود آپؐ نے شرکت نہیں فرمائی بلکہ آپؐ نے کسی صحابی کی سرکردگی میں فوجی سہم روانہ کی ہو۔ اس طرح عہد نبوت کی ساری دفاعی فوجی سہمات کو دو قسموں پر منقسم کر دیا گیا ہے اور انہیں اصطلاحی نام غزوات و سرایا دے دیے گئے ہیں تاکہ ان دونوں قسموں کی سہمات میں امتیاز قایم رہے۔

غزوۂ تبوک عہد نبوت کا آخری غزوہ ہے۔ چونکہ کچھ دنوں سے حجاز میں سخت قحط تھا اور صحابہ بڑی تنگدستی و عسرت میں مبتلا تھے اس لئے اس غزوہ کو غزوۃ العسرۃ اور جیش العسرۃ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ اس غزوہ میں آپؐ ماہ رجب ۹ ہجری مطابق اکتوبر و نومبر ۶۳۰ع میں تیس ہزار صحابہ کو لیکر مقام تبوک تک تشریف لے گئے اور بیس دن تک وہاں قیام پذیر رہ کر واپس مدینہ تشریف لائے تھے اس لئے اسے غزوۂ تبوک کہا جاتا ہے۔

تبوک دمشق سے مدینہ جانے والی ریلوے لائن کا ایک اسٹیشن ہے۔ یہ اس وقت سعودی عرب کا شام کی سرحد پر تقریباً آخری حصہ ہے جو مقام تیماء سے ۳۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اور اب بھی تبوک ہی کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں پہاڑیوں سے گھرا ہوا ایک وسیع میدان ہے جس میں مسلمانوں نے غزوۂ تبوک کے وقت قیام فرمایا تھا۔

اس غزوہ میں جنگ نہیں ہوئی تھی کیونکہ بنو غسان اور رومی شہنشاہی کی افواج کے مجتمع ہونے کی اطلاع جس پر یہ دفاعی تدبیر اختیار کی گئی تھی وہ اطلاع صحیح نہ تھی۔ رومی فوجیں دمشق سے آگے نہیں گئی تھیں اور بنی غسان، لخم اور بنو جذام کے لوگ مدینہ منورہ پر حملہ کے لئے ابھی اکٹھے نہیں ہونے پائے تھے۔ دشمنوں کے حوصلے بر وقت دفاعی تدبیر کی وجہ سے پست ہوگئے۔ اور مقابلہ کی نوبت نہ آئی۔ آپ ص نے زمانہ قیام تبوک میں رومیوں کے زیر نگیں ریاستوں سے صلحنامے کرلئے اور انھیں امن کی برقراری کا پابند بنالیا۔

غزوۂ تبوک کی تفصیلات اور اس کے نتائج کا ذکر اس وقت مقصود نہیں ہے بلکہ مقصد صرف اس خطبہ کا ذکر ہے جو آپ ص نے مقام تبوک میں ارشاد فرمایا تھا۔ یہ خطبہ حمد باری تعالی کے بعد صرف پچاس مختصر فقرات پر مشتمل ہے مگر ہر فقرہ ایک گوہر آبدار ہے اور حضرت افصح العرب و العجم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ فصاحت و بلاغت کا ایک بے مثال نمونہ ہے۔ فصاحت کا یہ عالم ہے کہ ہر لفظ ایک تابناک موتی ہے اور بلاغت کا یہ حال ہے کہ انسانی کردار کا کوئی پہلو نہیں جو اس کے احاطہ سے باہر ہو۔

ہم یہ خطبہ مع ترجمہ و مختصر تشریح پیش کرتے ہیں اور اس اقرار عجز کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ ان بلیغ فقروں کا صحیح ترجمہ اور پوری تشریح پیش کرنا محال کی حد تک مشکل ہے۔

آپ ص نے اللہ جل جلالہ کی حمد کے بعد فرمایا :-

اما بعد :

(۱) فان اصدق الحدیث کتاب اللہ — بلا شبہ سب سے زیادہ سچی بات اللہ کی کتاب (قرآن مجید) ہے۔

اگر کوئی بات مطابق واقعہ ہو تو اسے سچی بات کہا جاتا ہے۔ انسان کا علم ناقص بھی ہے اور غیر محیط بھی۔ پھر ماضی و حال کا علم تو انسان کو

کچھ نہ کچھ حاصل ہو سکتا ہے لیکن مستقبل کے واقعہ کا علم کسی انسان کو حاصل ہی نہیں ہو سکتا ۔ اس لئے یقیناً سب سے زیادہ سچی بات اللہ تعالی ہی کی بات ہوسکتی ہے جس کے حضور میں ماضی و مستقبل دونوں ہی حاضر ہیں ۔ وہ نہ کبھی بھولتا ہے اور نہ کوئی ذرہ اس کے علم محیط سے باہر ہے ۔

(۲) وا وثق العری کلمۃ التقوی — اور سب سے مضبوط حلقۂ زنجیر تقوی کا ایک لفظ ہے

تقوی قلب انسانی کی اس کیفیت کا نام ہے جس کی وجہ سے انسان اپنے افکار و اعمال میں خالق کائنات کی نافرمانی اور ہر قسم کی بے اعتدالی سے بچنے کی کوشش کرتا ہے ۔ ہر انسان کی یہ فطری خواہش ہے کہ وہ بلند سے بلند مقام پر پہنچ جائے ۔ اس بلند مقام پر چڑھنا مشکل کام ہے آدمی اس کے لئے زنجیر کا سہارا لیتا ہے تاکہ کہیں اس کا پیر نہ پھسل جائے ۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر زنجیر کا وہ حلقہ کمزور ہو اور ٹوٹ جائے تو کیا ہو ۔ اس لئے آدمی مضبوط ترین حلقۂ زنجیر کی تلاش کرتا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے کہ "سب سے مضبوط حلقۂ زنجیر تقوی ہے" اگر تم اس حلقہ کو پکڑے رہو گے تو اس کے ٹوٹ جانے کا کوئی خطرہ نہیں کہ تم مقام رفیع پر پہنچنے کی بجائے قعر مذلت میں گر کر ہلاک ہو جاؤ ۔

ذرا اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس اصول کو آزما کر دیکھئے ۔ کتنی اچھی تشبیہ ہے ۔ اگر تقوی سے قلب خالی ہو تو کوئی دوسری زنجیر اور اس کے حلقے انسان کو کہاں کام آتے ہیں ۔ ابھی سر بلندی و نام وری کے مقام اعلی پر نظر آرہے تھے اور اک ذرہ بے اعتدالی ہوئی تو ذلت و رسوائی نفرت و حقارت سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ نہ گھر کی زندگی خوشگوار رہتی ہے اور نہ باہر کی ۔ یہ کیوں ہوتا ہے صرف اس لئے کہ ہم تقوی کے مضبوط حلقۂ زنجیر کو چھوڑ کر کسی اور ڈوری کے ذریعہ اوپر چڑھنے کی کوشش کررہے تھے ۔ اپنے اوپر

جانے کے لئے سہارا بنایا تھا اقتدار کو، صاحب اقتدار کو، دولت کو، ثروت اور حکومت کو، یہ زنجیریں مضبوط نہیں ہیں ذرا سے کھینچ تان میں ٹوٹ جاتی ہیں اور ہم گر جاتے ہیں ۔

(۳) وخیر الملل ملة ابراهیم ۔ اور بہترین ملت ابراہیم (علیہ السلام) کی ملت ہے ۔

اس ایک بلیغ جملہ کی تشریح کی جائے تو شاید ایک دفتر ہوجائے ۔ مختصراً یہ سنئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ملت کی بنیاد عقیدۂ توحید پر رکھی تھی ۔ اسی عقیدہ کا نتیجہ تھا کہ وہ نمرود اور اس کے ماننے والوں سے الگ ایک ملت کے امام قرار پاگئے ۔ اس طرح دونوں ملتیں الگ الگ ہوگئیں ۔ ایک ملت ابراہیمی اور دوسری ملت نمرودی ۔ ملت نمرودی کی بنیاد اقتدار دنیاوی اور حاکمانہ قوت کی نمود پر قائم ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ اقتدار و حکومت کسی ایک نسل کے ہاتھوں میں یا ایک محدود رقبۂ وطن کے اندر ہوسکتی ہے ۔ اب اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ جو اس وطن کا یا اس نسل کا سربراہ ہوگا اسے معبود و مسجود کا مقام حاصل ہوجائے گا ۔ اس کا نام مختلف اوقات میں مختلف ہوسکتا ہے ۔ کہیں نمرود، کہیں فرعون، کہیں جمشید، کہیں رام‌چندر، کہیں مسولینی، کہیں ہٹلر، اور کہیں لینن و اسٹالن، اور اس کے مقابلہ میں افراد انسانی کا مقام ھل چلانے والے بیلوں سے اونچا نہیں ہوسکتا ۔

ملت نمرودی میں اسی لئے متعدد ملتوں کا تصور پیدا ہوتا ہے ۔ کہیں پروشین نسل سے ایک ملت وجود میں آتی ہے اور کہیں عربی نسل سے ۔ کبھی ایک رقبہ زمین سے ایک ملت وجود میں آتی ہے اور کبھی دوسرے رقبۂ زمین سے ۔ پھر ملت نمرودی سے پیدا شدہ یہ ساری ملتیں ایک دوسرے کا استحصال کرتی ہیں ۔ اور اس کے بعد ٹکراؤ ہوتا ہے ۔ خون کی ندیاں بہنے

لگتی ھیں ۔ بم برستے ھیں، سہاگ لٹتے ھیں، بچے نیزوں پر اچھالے جاتے ھیں اور وہ سب کچھ ھوتا ھے جو دنیا دیکھ رھی ھے ۔ عوام چاھے کہیں کے ھوں اور کسی عقیدہ و مسلک کے حامل ھوں، استحصال اور بدامنی کو پسند نہیں کرتے لیکن ملت کی بنیاد جب نسل یا وطن پر رکھی جاتی ھے تو اس کے لیڈر دوسرے انسانوں ھی کے اعزاز و اکرام سے نہیں بلکہ خود اپنے عوام کی عزت و آبرو اور امن و اطمینان سے غافل ھوجاتے ھیں ۔

اس کے برخلاف ملت ابراھیمی کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ھے عقیدہ توحید کے دو رخ ھیں، ایک تو یہ کہ ھمارا اور ساری کائنات کا خالق ایک اور صرف ایک ھے ۔ ھم اس کے حکم سے سر سو تفاوت نہیں کرسکتے، ھمارا ھر عمل صرف اللہ ھی کے لئے ھونا چاھئے ۔ ایک جہاد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک کافر کو زیر کر لیا اور اس کے سینہ پر بیٹھ کر اس کا سر کاٹ دینا چاھتے تھے کہ اس نے حضرت علیؓ کے منہ پر تھوک دیا، اس کے بعد حضرت اس کے سینہ سے اتر گئے ۔ جب اس نے پوچھا کہ آپ نے مجھے چھوڑ کیوں دیا ۔ تو فرمایا کہ میں تجھکو اللہ کے حکم سے اور اللہ کی رضا کے لئے قتل کر رھا تھا، جب تو نے مجھ پر تھوک دیا تو مجھے اپنی توھین پر غصہ آگیا، اور کسی انسان کو میں اپنی خوشی کے لئے تو قتل نہیں کرسکتا ۔

عقیدۂ توحید کا دوسرا رخ یہ ھے کہ ساری کائنات اللہ کی مخلوق ھے اور مخلوق ھونے کی حیثیت میں برابر ھے ۔ اس حیثیت سے نہ ھم اس سے بہتر ھیں اور وہ ھم سے برتر۔ اس عقیدہ سے جہاں انسان میں عزت نفس کا تصور ابہرتا ھے وھاں دوسروں سے محبت کا جذبہ بھی بیدار ھوتا ھے ۔ یہی عقیدہ ھے جو آدمی تو آدمی، جانوروں کے ساتھ بے رحمی کرنے سے بھی ھمیں روکتا ھے ۔ دشمن کی کھیتیوں کو ویران کرنے، باغوں کو کاٹ کر پامال کرنے سے ھمیں باز رکھتا ھے ۔

غرض یہ کہ ملت ابراہیمی کی بنیادیں نہ نسل پر قایم ہیں نہ وطن پر، نہ زبان پر قایم اور نہ رہن سہن پر، یہ سب بنیادیں ملت نمرودی اور حکمت فرعونی کی بنیادیں ہیں - علامہ اقبال مرحوم نے اسے یوں بیان کیا ہے :

از نسب بنیاد تعمیر اسم  با وطن وابستہ تقدیر اسم
ملت ما را اساس دیگر است  آن اساس اندر دل ما مضمر است

ذرا غور کیجئے، کتنی غیر حقیقی اور غیر عقلی ہیں ملت نمرودی کی بنیادیں - ابھی تیس بتیس سال پہلے تک انگریزوں کے اقتدار نے پاکستان، ہندوستان، برما، سری لنکا، بلکہ عدن تک کو ایک وطن بنا رکھا تھا - اور ابھی کل کی بات ہے کہ وطن پاکستان کی حدود میں ڈھاکہ، چاٹگام اور سلہٹ بھی داخل ہی تھے - کیا اقتدار کے اس پھیلاؤ کو وطن کا نام دے کر کسی ملت کی اساس قرار دینا دانائی کہا جا سکتا ہے - وطن صرف ایک انتظامی وحدت ہوتا ہے ایک انتظامی اقتدار کے ماتحت جتنا رقبۂ زمین ہوتا ہے اس کا نام وطن رکھ لیا جاتا ہے - اس سے زیادہ وطن کی اور کوئی حقیقت نہیں - اگر اس کو قلبی تعلق اور ہم آہنگی کی اساس قرار دے کر ایک ملت کی بنیاد بنادیا جائے تو اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم آہنگی کا دائرہ ایک ملک سے ایک صوبہ، ایک صوبہ سے ایک ضلع اور ایک ضلع سے ایک گاؤں تک محدود ہوکر رہ جاتا ہے -

یہی حال نسل کا ہے - اپنا بھائی پیارا - چچا کا بیٹا اس سے کم پیارا - دادا کے بھائی کی اولاد اس سے بھی کم - تین چار پشتوں میں قلبی تعلق کمزور ہوتے ہوتے بے اثر ہوکر رہ جاتا ہے - اسی طرح زبان اور رہن سہن کے طور طریقے بھی ملت کے لئے کوئی بنیاد مہیا نہیں کرتے - زبان صرف افہام و تفہیم کا ذریعہ ہے اور رہن سہن کے طریقے ماحول کے اثر سے ایک صورت اختیار کرلیتے ہیں - ان میں یہ قوت نہیں ہے کہ ایک انسان کو دوسرے

انسان کے دل سے قریب تر کردیں اور اس قربت کو تا بہ دیر باقی بھی رکھ سکیں'۔ ثقافت اور کلچر کا کلمہ پڑھنے والے فکری و دماغی قوت کے اعتبار سے کمزور اور مفلس لوگ ھیں ۔ یہ کوئی عقل کی بات نہیں کہتے۔ انسان صرف عقیدہ اور عمل کی بنیاد پر ھم آھنگی قایم رکھ سکتا ہے۔ اس کے سوا جو ھم آھنگی دکھائی دیتی ہے، اس کی حیثیت چوروں کے اتحاد سے زیادہ کچھ نہیں ۔ چور چوری کرنے کے لئے اتحاد قایم کر لیتے ھیں، اور ایسا اتحاد قایم کر لیتے ھیں کہ کسی مخلص وطنی حکومت کے وزیروں میں بھی ایسی ھم آھنگی اور نظم و ضبط نہیں دکھائی دیتا۔ لیکن چوری کا مال تقسیم کرتے وقت اکثر یہ اتحاد باقی نہیں رھتا۔

آپ اس بلیغ جملہ پر کہ "سب سے بہترین ملت ابراھیم علیہ السلام کی ملت ہے،، جس قدر غور کریں گے ۔ اور دنیا کے حالات کو اس کی روشنی میں دیکھیں گے، آپ پر اس کی صداقت کھلتی جائے گی۔

(۴) وخیر السنن سنة محمد — اور بہترین سنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت (طیبہ) ہے۔

سنت کے معنی ھیں وہ پگڈنڈی جو کسی کے چلنے سے ریت یا نرم زمین پر بن جاتی ہے۔ دیہاتوں میں اس پگڈنڈی (یعنی کچے راستہ) کو بڑی اھمیت حاصل ہے۔ اگر آدمی غلط پگڈنڈی پر پڑ جائے تو نہ جانے کہاں سے کہاں جا پہنچے۔ اور عرب کی ریتیلی زمین میں ریت پر نشان پا ھی سب کچھ ہے۔ غلط راہ پر کوئی پڑجائے تو بے آب و دانہ صحراؤں میں اپنی جان ھی گنوا بیٹھے گا۔ اس جگہ سنت محمد سے مراد زندگی بسر کرنے کا وہ راستہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نشان قدم سے بن کر تیار ھوا ہے۔

دنیا میں کڑوروں ھی آدمی پیدا ھوتے ھیں، جوان ھوتے ھیں، کماتے کھاتے ھیں ۔ شادی کرتے ھیں، بال بچوں کی پرورش کرتے ھیں، اپنے کنبوں

ہمسایوں، ہم وطنوں اور سارے ہی انسانوں کی خدمتیں کرتے ہیں - اور ایک وقت آتا ہے کہ اس دنیا سے چلے جاتے ہیں - ان کو چھوڑیئے جو ظلم و تعدی کرتے ہیں، قتل و خونریزی کو پیشہ بنالیتے، چوری، ڈاکہ اور فریب سے روزی کماتے ہیں - اچھوں ہی کو لیجئے جنھیں ہم آپ سب اچھے کہتے ہیں - ان کی زندگی بسر کرنے سے یا دوسرے لفظوں میں ان کے نشان قدم سے زندگی کی جو راہ متعین ہوتی ہے یا جو پگڈنڈی بن کر تیار ہوتی ہے - اس پر غور تو کیجئے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ایک آدمی بھی ایسا اس دنیا میں آیا ہے جس کی زندگی ہر پہلو سے مکمل اور کامیاب ہو اور جس کو ہم اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں اور مختلف حیثیتوں میں نمونۂ زندگی بنا سکیں ؟ دنیا میں بہت سے بزرگ آئے اور بعض بعض پہلوؤں سے انھیں بہترین نمونہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے - مثلاً حضرت عیسی مسیح علیہ السلام سے سیکڑوں سال پہلے ایک بزرگ دنیا میں آئے انھوں نے راج پاٹ چھوڑ، بیوی بچہ سے منہ موڑ خدا کی یاد میں اپنے آپ کو غرق کردیا - بڑا کام کیا، لیکن معصوم بچے کا باپ کہاں گیا - عصمت مآب بیوی کا شوہر کہاں گم ہو گیا - بوڑھے باپ کا سعید بیٹا کہاں چھپ گیا - خدا کی یاد اور سب حقداروں کو بھلا کر ؟

اسی طرح اور نمونے بھی ملیں گے مگر محض یک رخے، ایک پہلو سے بہترین اور دوسرے پہلو سے ناقص - ایک بزرگ ملیں گے سچے، راستباز، نیکوکار مگر نہ شادی کی، نہ بچے دیکھے، نہ خوشی سے واسطہ پڑا، نہ غم سے - نہ کسی مظلوم کا حق ظالم سے دلایا اور نہ ظالم سے ٹکر لی - بڑی ہی قابل تعریف زندگی ہے مگر ان کے نشان پا سے بنی ہوئی سنت (پگڈنڈی) انسانوں کے لئے بہترین سنت نہیں ہو سکتی -

اب ذرا سنت محمد ص کو دیکھئے - اچھے جوان، صادق و امین، اچھے شوہر، اچھے باپ، اچھے تاجر، اچھے دوست، رحم دل، نیکو کار، سخی اور حلیم، اللہ

کا پیغام سنانے والے۔ ظلم کا بدلہ دعاؤں سے دینے والے۔ خطاکار سے درگزر کرنے والے، یتیموں کے والی، غلاموں کے مولی، اور اسی کے ساتھ بہترین سردار، اعلی درجہ کے سپہ سالار، حاکم عادل۔ اتنے غریب کہ کئی کئی وقت مسلسل فاقہ ہوجائے اور اتنے دولت مند کہ مسجد نبوی میں طلائی اشرفیوں کے ڈھیر لگ جائیں۔

اتنی جامعیت اور ایسی کاملیت کہاں ملے گی۔ اگر ان کی سنت خیر السنن نہ ہوگی تو کس کی راہ زندگی خیر السنن قرار پائے گی۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ آپ ص نے یہ خطبہ ۹ ھجری کے ماہ رجب میں دیا ہے جب کہ آپ ص کی زندگی کا باسٹھواں سال ہے۔ مکہ مکرمہ فتح ہو چکا ہے اور آپ ص کے زیر نگیں تقریباً سارا ہی عرب آچکا ہے۔ اس فقرہ کی نوعیت صرف دعوی کی نہیں ہے بلکہ بیان حقیقت کی ہے۔ ان تیس ہزار بزرگوں میں سے بہت سے وہ حضرات ہیں جنھوں نے آپ ص کو زمانۂ طفلی سے اب تک مسلسل دیکھا ہے، اور بہت سے وہ ہیں جنھوں نے ابتدائے نزول وحی سے گزشتہ تقریباً ۲۲ سال کا زمانہ آپ ص سے انتہائی قریب تر رہ کر بسر کیا ہے۔ سفر و حضر میں ساتھ رہے ہیں، ان کی آنکھوں سے آپ ص کی زندگی کا کونسا رخ پوشیدہ ہے؟ وہ سب کچھ جانتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ آپ ص کی سنت خیرالسنن ہے۔ آپ ص کے سامنے ہی نہیں بلکہ آپ ص کی وفات کے بعد بھی صحابہ ساری دنیا کو یہی پیغام دیتے رہے کہ :

محمد کا رستہ نہ چھوڑو عزیزو یہی راستہ ہے ہمارا تمہارا

(۵) واشرف الحدیث ذکر اللہ۔ اور سب سے اشرف بات اللہ کی یاد ہے۔

باتیں تو ہم آپ سب ہی کرتے رہتے ہیں اور صبح سے شام تک نہ جانے کتنی ہی باتیں کرجاتے ہیں۔ اگر ان ساری باتوں کا ہم جائزہ لیں تو ان کی دو قسمیں بن جاتی ہیں، ایک وہ جن کے ساتھ اللہ تعالی کی یاد بھی ہمارے ذہن پر طاری ہوتی ہے اور دوسری وہ جن کے ساتھ اللہ تعالی کی یاد

ذھن میں نہیں ھوتی ھے۔ پہلی قسم میں ھماری وہ باتیں ھوتی ھیں جن سے ھمارا مقصد سننے والے کو کسی قسم کا فائدہ پہنچانا یا اپنے لئے کوئی جایز فائدہ حاصل کرنا ھوتا ھے۔ یہ باتیں جھوٹ، غیبت، عیب جوئی، جھوٹی شیخی، اور شہرت طلبی کی آلایشوں سے تقریباً پاک و صاف ھوتی ھیں۔ باتوں کی دوسری قسم یعنی اللہ تعالی کی یاد سے خالی گفتگو میں بے فائدہ یاوہ گوئی، فریب، استحصال ناجایز، کذب و افتراء اور ایسے ھی عیوب کی آمیزش ھوا کرتی ھے۔ افواہ ایسی ھی گفتگو سے پھیلا کرتی ھے۔ ھر شخص خود اپنی جگہ پر اس کا فیصلہ کر سکتا ھے کہ باشرف و باعزت گفتگو کس قسم کی گفتگو کو کہا جا سکتا۔

(٦) و احسن القصص ھذا القرآن۔ اور سب سے اچھا قصہ یہ قرآن (مجید) ھے۔

کسی گزرے ھوئے واقعہ کی حکایت کو قصہ کہا جاتا ھے۔ قصہ کہانیوں کا ذوق ھر جگہ پایا جاتا ھے۔ آپ بیتی سے جگ بیتی زیادہ خوشگوار ھوتی ھے افریقہ کے 'بش مین' اور بانتو سے لے کر جامعات کے اساتذہ تک کسی نہ کسی قدر دلچسپی قصہ کہانیوں میں لیتے ھیں۔ آدمی کی عادت و کردار کی صورت گری میں قصہ کہانیوں کا بڑا حصہ ھوتا ھے۔ اچھے قصوں سے آدمی یہ جان لیتا ھے کہ غفلت و غلط روی کے نتائج کیا ھوتے ھیں۔ اور چستی و ھوشیاری کے ساتھ زندگی بسر کرنے سے کیا فوائد حاصل ھوتے ھیں۔ لیکن یہ فوائد صحیح طور پر اور پوری طرح صرف اسی وقت حاصل ھوسکتے ھیں جب کہ ان قصوں کے صحیح اور حقیقۃً سچ ھونے کا یقین یا کم از کم ظن غالب قصہ سننے یا پڑھنے والے کو حاصل ھو۔ پہلے سے اگر یہ یقین موجود ھو کہ قصہ فرضی اور غلط ھے تو سننے والا اس سے کوئی اثر نہیں لے سکتا۔ یہی وجہ ھے کہ نا پختہ دماغ ننھے بچے تو پریوں کی کہانی سے اثر پذیر ھوتے ھیں لیکن کوئی پختہ دماغ اور تعلیم یافتہ آدمی ان کہانیوں سے متاثر نہیں ھوتا۔

قصہ کا اصل مقصود ھی یہ ھے کہ سننے والا اس سے اثر لے اور اپنی عادت و کردار کے سنوارنے میں اس اثر سے فائدہ بھی حاصل کرے ۔ اور ھم یہ دیکھتے ھیں کہ کسی قصہ کا کوئی اثر پختہ دماغ آدمی پر نہیں ھو سکتا جب تک کہ اس قصہ کے سچ، حقیقی اور واقعی ھونے کا یقین قلب میں جاگزیں نہ ھو۔

ھر مومن کا یہ ایمان و یقین ھے کہ قرآن مجید اللہ کی کتاب ھے اور اس میں جو کچھ بیان کیا گیا ھے تمام تر سچ ھے جس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی کوئی گنجایش نہیں ۔ اس کے بعد قرآن مجید میں بیان کئے ھوئے قصے سے ھمیں جو فائدہ پہنچ سکتا ھے، بالکل ظاھر ھے ۔ اسی لئے قرآن مجید کو آپ صلعم نے احسن القصص فرمایا ھے ۔

(۷) و خیر الاسور عوازمہا ۔ اور سب سے اچھا کام وہ ھے جو پوری توجہ کے ساتھ صحیح طور پر کیا جائے ۔

آپ کوئی کام کریں اسے پوری توجہ کے ساتھ صحیح طور پر انجام دیں اور استقلال کے ساتھ اس میں لگے رھیں ۔ اسی کو عوازم الاسور سے تعبیر فرمایا گیا ھے ۔ اسور دنیا و دین، ھر کام کے لئے یہ ضروری ھے کہ آپ اس کے لئے اپنے دل میں عزم و ارادہ پیدا کریں ۔ اس کو پوری توجہ کے ساتھ پورا کریں اس میں سے کچھ کم نہ ھونے دیں، اور کوئی نئی بات (بدعت) اس میں نہ پیدا کریں ۔ پھر یہ کہ آپ اس کام کو چھوڑ نہ دیں استقلال کے ساتھ اس میں لگے رھیں ۔ کام کی انجام دھی سے صحیح فائدہ آپ اسی طرح حاصل کرسکتے ھیں ۔

مثلاً آپ کو بتایا گیا ھے کہ صبح کی نماز میں دو سنت اور دو فرض رکعتیں ھیں ۔ آپ پوری توجہ اور اطمینان کے ساتھ یہ دو دو رکعتیں پڑھئے، اتنی جلدی اور تیزی کے ساتھ نہ پڑھئے کہ رکوع و سجدہ کا پورا حق بھی نہ ادا ھو، اور نہ اپنی طرف سے اس میں کوئی اضافہ کردیجئے ۔ ھوسکتا ھے کہ

دن کی پہلی نماز میں صرف دو دو رکعتیں دیکھ کر آپ کے دل میں یہ شیطانی وسوسہ آجائے کہ ہم اسے چار چار رکعت بنادیں۔ یہ شر الامور بدعت ھی نہیں بلکہ اللہ و رسول کی صریح نافرمانی ہوگی۔ اللہ کے رسول نے ھمیں صبح کی نماز دو رکعت سنت اور دو رکعت فرض ھی سکھائی ھیں اور یہی صحیح ھے۔

یہ صرف ایک مثال تھی، نماز ھی نہیں بلکہ اور تمام امور میں بھی ھمیں یہ ھمیشہ یاد رکھنا چاھئے کہ کام وھی بہتر ھے جو پوری توجہ کے ساتھ صحیح طور پر کیا جائے۔ اور استقلال کے ساتھ اسے انجام دیا جائے۔

(۸) و شر الامور محدثاتھا ۔ اور سب سے برا کام وہ ھے جو اصل کام پر نیا اضافہ (یعنی بدعت) ھو،

عام طور پر لوگ مذھبی کاموں میں جدید اضافے کرلیا کرتے ھیں جن کی کوئی اصل شرعی احکام میں نہیں ملتی۔ اس کے بعد جب ان کو اس کی طرف توجہ دلائی جاتی ھے تو کہتے ھیں کہ اس میں کیا حرج ھے، اس طرح قوموں میں نئے نئے عقاید اور رسوم ڈھلتے رھتے ھیں اور تھوڑے دنوں کے بعد یہ عقاید اور یہ بدعتی مراسم اصلی دین کی جگہ لے لیتے ھیں۔ سارا مذھبی نظام چند بدعتی مراسم کا مجموعہ ھو جاتا ھے۔ اصل تعلیم و عقاید تو پیچھے چلے جاتے ھیں، سارا زور اس بدعت پر دیا جاتا ھے۔ اس طرح قومیں آھستہ آھستہ رسم و رواج کی پابند ھوکر مذھب کی اصل روح سے بیگانہ ھو جاتی ھیں عبادات میں بھی اور عام زندگی میں بھی۔

اس کی مثال دنیا کی مختلف قوموں میں اور خود مسلمانوں میں بھی ھر روز اور ھر جگہ دیکھی جاسکتی ھے۔ قرآن مجید نے رھبانیت کے متعلق یہ بتایا ھے کہ نصاری نے یہ نئی بات خود ھی پیدا کرلی، انھیں اس کا کوئی حکم کبھی نہیں دیاگیا تھا کہ دنیا سے کنارہ کش ھوکر صحراؤں اور پہاڑوں میں مسکن بنا لیں اور اللہ تعالی کی رضامندی حاصل کرنے کا ایسا طریقہ اختیار کرلیں

جس کے نتیجه کے طور پر ان کی زندگی بے کار و بے معنی هو جائے۔ پہاڑ کے پتھروں اور درختوں سے بھی کمتر درجه پر جاپہنچیں اور زندگی سے افادیت بالکلیه مفقود هوجائے۔ لیکن نصاری هی نهیں بلکه مسلمانوں نے بھی بزرگی اور ولایت کا معیار اسی بدعت کو قرار دے لیا۔ مسلمان اپنی زندگی میں غور سے بدعت کی کارفرمائی اور مراسم پرستی کو دیکھیں، عبادتوں میں کتنی بدعتوں کے هم پابند هیں۔ اور اجتمائی و عائلی زندگی میں مراسم پرستی نے همیں اصلی روح اسلامی سے کس قدر بیگانه بنا دیا ہے۔

(۹) واحسن الهدی هدی الانبیاء اورسب سے اچھی راه (راه زندگی) انبیاء کی راه ہے۔

دیکھنے میں یه ایک مختصر سا فقره ہے لیکن عملی زندگی کے لئے ایک مشعل راه کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ اپنی زندگی پر غور کریں اور دوسروں کی زندگیوں کو دیکھیں، هم جو کچھ جانتے هیں اور جو اعمال کرتے هیں ان کا تقریباً نوے فیصد حصه وه ہے جو هم دوسروں کے اقوال و اعمال کو دیکھ کر حاصل کرتے هیں اور اپنے لئے اختیار کرلیتے هیں۔ هم نے اپنے بزرگوں اور اساتذه کو جو کچھ کہتے هوئے سنا اور کرتے هوئے دیکھا ہے اس کی نقلیں اپنی ساری عمر کیا کرتے هیں۔ اس طرح هم کو اپنی زندگی کے هر هر موڑ پر رهنمائی کی ضرورت محسوس هوتی ہے۔ اب ایک وقت وه آتا ہے که هماری عقلیں نسبةً پخته هوجاتی هیں اور همارے سامنے یه سوال آتا ہے که جو مثالیں زندگی کی همیں ملتی هیں یا جو راهیں همیں دنیا کے عاقل و فلسفی دکھاتے هیں یا جو صراط مستقیم همارے سامنے انبیائے کرام نے پیش کی ہے ان میں سے کونسی راه بہتر ہے اور کسے هم احسن قرار دے کر اختیار کریں۔ یه بڑا مشکل سوال ہے۔ اگر هم نے اپنے لئے غلط راه کا انتخاب کرلیا یا ایک ایسی راه زندگی۔ هم نے پکڑ لی جس پر چل کر کامیاب زندگی هم بسر نه کرسکے

تو یقیناً ہم بڑے نقصان میں رہیں گے۔ اس گنجلک اور اہم سوال کا یہ جواب ہے کہ انبیائے کرام کی بتائی ہوئی راہ احسن اور اولی ہے، اسی کو اختیار کرو۔

انبیائے کرام کی بتائی ہوئی راہ کیوں سب سے اولی و احسن ہے۔ اس پر غور کر لیجئے۔

زندگی کی راہیں تو ہمارے سامنے متعدد ہیں اور ایک دوسری سے مختلف و متنوع بھی ہیں۔ ایک وہ راہ ہے جو فلسفیان ما بعد الطبعیات نے بتائی ہے۔ ایک وہ ہے جو تارک الدنیا راہبوں نے دکھائی ہے، ایک وہ ہے جو زر اندوز محبان دولت کی راہ ہے۔ ایک وہ ہے جو خود غرض فاتحین نے پیش کی ہے، ایک وہ ہے جو جھوٹے مدعیان نبوت والوہیت کی راہ ہے، اور ایک وہ ہے جو اللہ تعالی کے انبیائے صادقین نے ہمیں دکھائی ہے۔ اب یہ اور اس قسم کی اور بہت سی راہوں پر غور کیجئے، سوچیے اور اچھی طرح سوچیے، وہ کونسی راہ ہے جس کو اختیار کرکے ہم دنیا میں خوش اور مطمئن زندگی بسر کرسکتے ہیں اور مرنے کے بعد اچھی اور خوشگوار زندگی کی امید کرسکتے ہیں۔ یہ تو بہر حال یقینی اور ناقابل انکار بات ہے کہ جس طرح اور سب لوگ مرگئے ہیں ہم بھی مرجائیں گے۔ اس لئے ہمیں راہ وہی اختیار کرنی چاہئے جو ہمیں اس عالم میں خوش و مطمئن زندگی بسر کرنے میں معاون ہو اور دوسرے عالم کی طویل زندگی میں خوش گواری کی کم از کم امید تو دلا سکے۔

فلسفیوں کی راہ اختیار کرنے سے نہ صرف روحانی خلاء پیدا ہو جاتا ہے بلکہ دل و دماغ کے مابین ایک نزاع دائمی پیدا ہوکر زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ خود ان فلسفیوں کی زندگیوں کو دیکھئے، قول و عمل میں تخالف، دل و دماغ کے مابین دائمی تنازع، شک بالائے شک اور عدم یقین کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ تارک الدنیا راہبوں اور سادھوؤں کی راہ کو دیکھئے۔ زندگی کا ہے کو ہوئی، نہ اپنے کام کی اور نہ کسی دوسرے کے کام کی، ایک صحرا نشین

سادھو کی زندگی اور اسی صحراء کے ایک تودۂ ریگ میں کیا فرق ہے۔ پہاڑ کے پتھر اور صحراء کی جھاڑیاں بھی اس سے زیادہ کار آمد نظر آئیں گی۔ دوسری غیر معتدل زندگی ایک زر اندوز پرستار دولت کی زندگی ہے، ساری عمر غم سیم و زر میں بسر کی، نہ کبھی حرص پوری ہوئی اور نہ کبھی فکر دولت سے نجات مل سکی۔ مر گئے اور سب کچھ یہیں رہ گیا۔ پھر زندگی میں بھی محض دولت کہاں کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ ضرورت سے زیادہ دولت جمع کی اور پھر اس میں اضافہ کی فکر میں گھلتے رہے، نہ خود فائدہ اٹھایا، نہ خدا کی راہ میں خرچ کرکے آخرت کی سر بلندی حاصل کی۔ اس دولت میں اور سنگریزوں میں کیا فرق رہا —ع

برائے نہادن چہ سنگ و چہ زر

دنیا کے بڑے بڑے فاتحین اور کشور کشاوں کی راہ کو دیکھئے۔ خطرات میں گھری ہوئی کیسی بے چین زندگی ہے، جب تک جیتے رہے، اپنے لئے اور دنیا کے لئے مصیبت بنے رہے اور جب مرگئے تو ساری دنیا کی لعنتیں لے کر خالی ہاتھ رخصت ہو گئے۔

لایا تھا کیا سکندر، کیا لے گیا جہاں سے

تھے دونوں ہاتھ خالی باھر کفن سے نکلے

ایک زندگی ہے جھوٹے مدعیان الوہیت، نبوت، ولایت و قیادت کی زندگی۔ کیسی نقلی اور بناوٹی زندگی ہے۔ ہر ہر منٹ نظر عوام سے گر جانے کا خطرہ، دل میں کچھ، زبان پر کچھ، یقین کچھ اور عمل کچھ۔ جب دیکھئے ہر بن مو سے چندہ چندہ کی آوازیں آرہی ہیں۔ غیروں کی کمائی پر خوش حالی کا مدار، کاھلی اور تن آسانی کے شکار۔ ہر ادا میں ریا، ہر چال میں شہرت و مقبولیت کی تمنا۔ خالق کائنات کی رضا سے بے فکری مگر عوام کی رضا مندی کے لئے ہر وقت کوشاں۔ اللہ کے خوف سے دل خالی لیکن عوام کے خوف سے ہراساں۔ یہ ہے ان کی 'ندگی۔

ان راہوں سے مختلف سچے انبیائے کرام کی زندگیوں کو دیکھئے ۔ فلسفیوں کی طرح کوئی نبی اپنے سے پہلے انبیاء کی تردید نہیں کرتا بلکہ تصدیق کرتا ہے اس کا یقین اس کے قول سے اور اس کا قول اس کے عمل سے کبھی مختلف نہیں ہوتا ۔ حضرت زکریا کے سر پر آرا چلا دیا گیا، حضرت یحیی کو قتل کردیا گیا لیکن مصلحت بینی انہیں اپنے یقین کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکلوانے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ حضرت یوسف کو اقتدار و دولت دی گئی، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کو بادشاہت عطا ہوئی لیکن ان کے اقوال و اعمال ان کے یقین و ایمان سے مختلف کبھی نہیں ہو سکے۔ ان پر یہ حالت کبھی طاری نہیں ہوئی کہ دل و دماغ کے مابین جنگ شروع ہو جاتی۔ وہ جو کچھ کرتے رہے اس یقین و ایمان کے ماتحت کرتے رہے کہ خالق کائنات کی رضا اسی عمل میں ہے۔

انبیائے کرام کی زندگیوں میں ایک یہ خصوصیت بھی نمایاں نظر آتی ہے کہ وہ لوگوں کو جو کچھ یقین و عمل کے لئے دیتے ہیں خود اس پر سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ عمل کرتے ہیں ۔ وہ اگر توحید پر یقین رکھنے کو کہتے ہیں تو خود سب سے زیادہ یقین رکھتے ہیں، وہ اگر عبادت بجا لانے کو کہتے ہیں تو خود سب سے زیادہ عبادت بجا لاتے ہیں ۔ وہ اگر دوسروں کا غم کھانے کی تلقین کرتے ہیں تو خود غیروں کے دکھ درد میں سب سے زیادہ شریک ہوتے ہیں ۔ اور یہ بات کسی مدعی میں آپ کو نہیں ملے گی۔

انبیائے کرام کی راہ زندگی اس لئے بھی بڑی حسین ہوتی ہے کہ وہ آدمی کی حیات کو ایک مسلسل غیر منقطع حقیقت ثابتہ کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور خود اس پر بدرجۂ کمال یقین رکھتے ہیں کہ موت کے بعد بھی ایک زندگی ہے جو دنیاوی زندگی سے ملحق ہے ۔ دنیاوی زندگی کے تمام ارادی عقاید و اعمال کا اس پر اثر پڑتا ہے ۔ اس عقیدہ کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کی حیات دنیاوی میں افادیت کا پہلو غالب رہتا ہے ۔ اعمال کے استفادی

تصور سے جو خود غرضیاں پیدا ہوتی ہیں اور معاشرے میں اس سے جو خرابیاں رونما ہوتی ہیں ان سب سے انبیاء کرام کی زندگیاں پاک اور مبرا ہوتی ہیں ۔

انبیائے کرامؑ ہمیں بتاتے ہیں کہ بہترین آدمی وہ ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔ اللہ کا محبوب بندہ وہ ہے جو محنت سے اپنے لئے کمائے اور اس کمائی میں سے سائل و محروم کو بھی دے۔ وہ شخص اللہ کا محبوب بندہ نہیں ہے جو دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرے ۔

اس طرح آپ جتنا زیادہ غور کریں گے اتنا ہی زیادہ آپ پر یہ حقیقت روشن ہوتی جائے گی کہ اللہ تعالی کے سچے نبی، اور سلسلۂ انبیاء کرام کی آخری اور تکمیلی شخصیت نے انبیائے کرام کی راہ زندگی کو احسن قرار دے کر کیسی عظیم الشان صداقت کی طرف توجہ دلائی ہے۔

(۱۰) و اشرف الموت قتل الشھداء — اور سب سے زیادہ با عزت موت شہیدوں کی موت ہے ۔

موت سے کس کو رستگاری ہے ۔ آخر ہم آپ سب ہی کو ایک نہ ایک دن موت آئے گی۔ چاہے ہسپتال کے بستر پر آئے یا میدان جہاد میں، موت تو بہرحال آئے گی۔ اب اگر زندگی کا مقصد خالق کائنات کی رضا کا حصول ہے تو زندگی اشرف و باعزت ہے، اور اگر موت کے وقت مرنے کا مقصد بھی یہی ہو تو اس موت کے کیا کہنے ہیں ۔ ایک شہید اپنی سب سے بڑی متاع یعنی حیات کو اپنے خالق کے حضور میں پیش کرکے جب یہ کہتا ہے کہ ۔

جان دی ،دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

تو یقیناً اس موت کو اشرف الموت ہی کہا جا سکتا ہے ۔ مرنے کو تو سب ہی مرتے ہیں لیکن شہید ایک مقصد کے لئے مرتا ہے اور دوسرے بے مقصد اور مجبوراً موت کا مزہ چکھتے ہیں۔ قرآن مجید میں شہداء کے جو مراتب

عالیه بتائے گئے ھیں وہ اس پر شاھد ھیں کہ ھر موت سے زیادہ بہتر موت شہید کی موت ھوتی ھے۔

(۱۱) و اعمی الاعمی الضلال بعد الھدیٰ — سیدھی راہ پا لینے کے بعد گمراھی سب سے بڑی بے بصری ھے۔

اس سے بڑا اندھا اور محروم بصر کون ھوسکتا ھے جسے سیدھی راہ دکھا دی جائے، وہ دیکھ بھی لے، لیکن اس کے بعد وہ اس راہ کو اختیار کرنے کی بجائے دوسری طرف چل پڑے اور راہ ڈھونڈھتا پھرے۔

بہ ظاھر یہ معلوم ھوتا ھے کہ بھلا ایسا کون آدمی ھوگا جو سیدھی راہ دیکھ لینے اور پا لینے کے بعد بھی دوسری طرف چل کر گمراہ ھو جائے۔ لیکن نھیں، ایسے آدمی بہت ھوتے ھیں جن کو سیدھی راہ دکھا دی جاتی ھے اور وہ خود بھی جانتے ھیں کہ سیدھا راستہ کیا ھے مگر اس کے باوجود وہ غلط راستوں پر لگ جاتے ھیں۔ کبھی برادری کے رسم و رواج کے آگے سپر انداز ھونے کی وجہ سے اور کبھی اپنی بیوی اور بچوں کے اصرار کی وجہ سے۔ غور سے گرد و پیش کو دیکھئے، عزیزوں اور ھمسایوں کی حالت پر غور کیجئے۔ ایسے اندھوں کی اس دنیا میں کوئی کمی نھیں ھے جو برادری میں ناسوری کے لئے سودی قرض لیتے ھیں۔ اور بیوی کی ناز برداری کے لئے رشوتیں۔ حالانکہ انھیں سیدھی راہ دکھا دی گئی ھے اور وہ اس سے پوری طرح واقف بھی ھیں۔ ریا اور ناسوری کی تمنا میں اسراف و تبذیر کی برائی سے کون واقف نھیں لیکن ان آنکھوں والے اندھوں کی کتنی بہتات ھے۔ یہی حال ان اندھوں کا ھے جو اللہ جل جلالہ پر ایمان رکھنے کے باوجود امید و بیم کا رشتہ مخلوقات سے جوڑتے پھرتے ھیں۔ یہ ھیں وہ اندھوں میں اندھے جن کو راہ دکھا دی گئی ھے اور انھوں نے راہ دیکھ بھی لی ھے، مگر اس کے باوجود وہ گمراھی میں بھٹک رھے ھیں۔ اور سب سے بڑے اندھے تو وہ ھیں جو اسلام کی ھدایت کو پا کر بھی بھٹک جاتے ھیں۔

(۱۲) وخیر الاعمال ما نفع — سب سے اچھا عمل وہ ہے جو نفع پہنچائے۔

کتنی سچی بات ہے، جس کام سے کوئی نفع ہی حاصل نہ ہو، اس میں وقت صرف کرنا کتنی بڑی نادانی ہوگی۔ ہمارے لئے سب سے قیمتی اور اہم چیز کیا ہے۔ ہر شخص اس کا ایک ہی جواب دے گا، اور وہ یہ کہ سب سے قیمتی اور اہم ترین دولت ہماری زندگی ہے۔ زندگی کسے کہتے ہیں۔ پیدایش سے موت تک کے وقت کو۔ اس طرح ہمارا وقت چاہے ایک منٹ ہی کیوں نہ ہو، ہماری قیمتی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ ہماری پوری زندگی ان ہی منٹوں، گھنٹوں، دنوں، مہینوں اور سالوں کا مجموعہ ہے۔ اب خود سوچ لیجئے کہ اگر آپ نے اپنا ایک منٹ بھی ایسے کام میں ضایع کردیا جس کا نفع نہیں تو آپ نے اپنی سب سے قیمتی دولت یعنی زندگی کو برباد کیا۔ ذرا ہم اپنی حماقتوں اور نادانیوں کو دیکھیں کہ ایک گھنٹہ بے کاری میں گذارا، دوسرا گھنٹہ فضول باتوں بلکہ غیبت اور عیب چینی میں بسر کیا، ڈھائی گھنٹے سنیما دیکھنے میں خرچ ہوئے اور دو گھنٹے کہانیاں سننے میں۔ زندگی یوں برباد کی کہ بے نفع کام کرتے رہے، ایسے کام کہ جن سے کوئی فائدہ نہ دنیا میں حاصل ہوتا ہے اور نہ آخرت میں۔ اس پر مزید مصیبت یہ کہ زندگی خدا کی امانت ہے اس کو بے نفع کاموں میں برباد کرنے کا قیامت میں حساب بھی دینا پڑے گا۔

(۱۳) وخیر الهدی ما اتبع — اور سب سے اچھا طریقہ وہ ہے جس کی اتباع کی جائے۔

یقیناً وہی طریقہ اچھا طریقہ زندگی ہے جس کی اتباع کی جائے ورنہ طریقۂ زندگی تو وہ بھی ہوتا ہے جس کی اتباع نہیں کی جاسکتی، مثلاً ایک شخص نے توکل اور قناعت کو غلط معنی پہنا کر کاہلی اور بے کاری کی زندگی شروع کردی۔ اپنے آپ کو قانع اور متوکل کا لقب دے کر بیٹھ رہا۔ اب اس کا گزر بسر

محض دوسروں کی امداد پر ہوگیا۔ اگر کوئی اس کے طریقۂ زندگی کی اتباع کرنا چاہے بھی تو کیسے کرے۔ سب لوگ ایسے ہی کاھل اور ناکارہ ہوکر بیٹھ جائیں تو ان کا گزر بسر کیسے ہو اور خود اس مرشد کی امداد کرنے والے کہاں سے آئیں ۔ ایک آدمی دن رات گیان دھیان میں لگا رہے تو اس کی اتباع کرنے والے کہاں سے لائے جائیں اور کس طرح زندگی کے دوسرے فرایض کی انجام دھی ہوسکے۔ اسی طرح ایک شخص کو دیکھئے جو دن رات دنیا کمانے میں لگا رھتا ہے نہ اسے اپنے گھر والوں کی خدمت کے لئے وقت ملتا ہے اور نہ ھمسایوں اور محلہ والوں کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کے لئے۔ اب اگر لوگ اس کی سی زندگی اختیار کرلیں تو معاشرے میں کیسی شدید خود غرضی پیدا ہوجائے اور کتنی مشکلات میں دنیا والے مبتلا ہو جائیں گے۔

اسی لئے ہادی برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہدایت فرمائی کہ طریقۂ حیات وھی بہتر ہے جس کی لوگ اتباع کرسکیں اور کریں۔

(۱۴) وشر العمی عمی القلب — اور بہت ھی بری نابینائی ہے دل کی نا بینائی۔

جو لوگ آنکھوں سے معذور اور نابینا ہوتے ھیں انھیں خود تو بے بصری سے بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑتی ھیں مگر دوسروں کو ان سے بہت زیادہ تکلیف نھیں پہنچتی، زیادہ سے زیادہ یہی تکلیف پہنچتی ہے کہ کبھی ان سے ٹھوکر لگ جائے یا اس کی لاٹھی سے کسی کو کبھی تھوڑی سی چوٹ آ جائے۔ لیکن جن کے قلوب سے بصیرت گم ہوجاتی ہے۔ اور خیر و شر میں تمئیز کی نظر باقی نہیں رھتی، حق و باطل کے مابین امتیاز ان کو نظر نہیں آتا۔ ایسے لوگ ساری دنیا کے لئے مصیبت کا سبب بن جاتے ھیں۔ یہ سب سے برا اندھا پن ہے۔ اگر ایسا آدمی کہیں صاحب اقتدار ہو تو سب سے زیادہ خطرناک اور عذاب ثابت ہوتا ہے ورنہ کم از کم اپنے گھر، محلہ، اور معاشرے کے لئے تو بہرحال

وہ ایک شر ہی ہوتا ہے جس سے بچتے رہنے کی ہر شخص کو فکر لگی رہتی ہے۔

ایسے اندھے جن کی آنکھیں دیکھتی ہیں۔ کان سنتے ہیں لیکن دل برائی اور بھلائی کے مابین تمیز کرنے سے قاصر ہے، بہت سے ملتے ہیں۔ گلیوں اور سڑکوں پر ملتے ہیں تجارتی گدیوں پر ملتے ہیں، سرکاری دفاتر کی کرسیوں پر ملتے ہیں۔ دوکانوں میں ملتے ہیں کاریگروں میں ملتے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ معلموں اور استادوں میں ملتے ہیں، کہاں نہیں ملتے؟ ایک استاد ہے کہ شاگردوں کے پیسوں سے ان ہی کے ساتھ سنیما دیکھنے جاتا ہے۔ ایک عہدیدار ہے کہ رشوت لینے کی ترکیبیں سوچتا رہتا ہے۔ ایک ہمسایہ ہے کہ گھر کی ہر گندہ چیز سڑک پر پھینک دیا کرتا ہے اور گندگی پھیلاتا رہتا ہے یہ سب آنکھوں سے بینا اور دل سے نابینا لوگ ہیں۔ ان کے دل یہ نہیں دیکھ سکتے کہ ان کی ان حرکتوں سے کیا برے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ کس طرح دوسروں کی تکلیف کا سبب بن رہے ہیں، ان حرکتوں سے دوسروں کو کس قدر دکھ اٹھانا پڑتا ہے یہ انہیں نظر ہی نہیں آتا۔ ایسوں کا اندھا پن خود ان کے لئے بھی شر ہے اور دوسروں کے لئے بھی شر۔

(۱۰) والید العلیا خیر من الید السفلی۔ — اور اوپر والا ہاتھ (دینے والا) نیچے والے ہاتھ (لینے والا) سے بہتر ہے۔

یہ اتنی واضح حقیقت ہے کہ اس کی تشریح ضروری نہیں۔ مانگنے والوں کو کس نے نہیں دیکھا ہے۔ ان کی اپنی نفسی کیفیت کیا ہوتی ہے، اس کو تو وہی جانتے ہیں لیکن دیکھنے والوں کی نظر میں کون سا ہاتھ بہتر دکھائی دیتا ہے اس کا روزانہ مشاہدہ ہم سب کو ہوتا ہے۔

مانگنے والے عموماً دو طرح کے ہوتے ہیں۔ اول وہ جو کسی وقت ضرورت سے مجبور ہوکر کچھ مانگتے ہیں۔ دوسرے وہ جنھوں نے گداگری کو بطور

پیشہ اختیار کیا ہے۔ پہلی قسم بھی آنکھوں میں ذلیل دکھائی دیتی ہے، اس کے لئے یہ بہتر ہوتا کہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے بغیر کسی نہ کسی طرح اپنی ضرورت پوری کرلیتا اور مانگنے کی ذلت سے اپنے آپ کو بچا لیتا۔ رہی دوسری قسم یعنی پیشہ ور گداگر، یہ ذلیل ہی نہیں بلکہ لعنتی بھی ہوتے ہیں۔ انہیں مرنے کے بعد شدید عذابوں میں ڈالا جائے گا۔ یہ لوگ کسی آبادی کے لئے نہایت ہی تکلیف دہ اور بدنما داغ ہوتے ہیں۔ ان کو خیرات دینا درحقیقت ان کی ہمت افزائی کرنا ہے اس لئے ہر مسلمان کو چاہئے کہ ان کو خیرات دینے سے احتراز کرے۔

ان پیشہ ور فقیروں میں ایک گروہ ہوتا ہے جو رنگین کپڑے پہن کر اور لوہے کے کڑے اور زنجیریں ڈال کر گھومتا پھرتا ہے۔ یہ لوگ اکثر جرائم پیشہ بھی ہوتے ہیں، لوگوں سے بہ جبر خیرات وصول کرتے ہیں۔ چوریاں کرتے ہیں، ڈاکے ڈالتے ہیں۔ ڈرا دھمکا کر پیسے مانگتے ہیں اور حیرت تو یہ ہے کہ بعض لوگ ان سے نفرت کرنے کی بجائے عقیدت بھی رکھتے ہیں۔

جمعہ اور عیدین کے موقع پر مسجد اور عید گاہ کے باہر پیشہ ور گداگروں کا ایک جم غفیر جمع ہوجاتا ہے۔ نہ یہ لوگ نماز میں شریک ہوتے ہیں اور نہ خطبہ سننے کی ان کو پرواہ ہوتی ہے۔ ادھر خطبہ ہورہا ہے اور ادھر یہ لوگ برابر چیخ چیخ کر بھیک مانگ رہے ہیں۔ ایسے کاہل، بدتمیز اور بے دین لوگوں کو خیرات اور فطرہ کی رقم دینا کسی طرح پسندیدہ عمل نہیں ہوسکتا۔

(۱٦) وما قل و کفی خیر مما کثر و الھی۔ — جو (مال) کم ہو اور ضرورت کے لئے کافی ہوجائے وہ اس مال سے بہتر ہے جو بہت ہو اور غافل کر دے۔

مال و دولت کیا چیز ہوتی ہے، علم معاشیات کی کتابوں میں دولت کی

بہت سی تعریفیں ملتی ھیں لیکن ان میں ذھانت کا کمال اور الفاظ کی بازیگری بھی ھوتی ھے۔ سیدھی سی بات یہی ھے کہ جو چیز انسان کی کسی حاجت کو پوری کردے وہ دولت ھے۔ پیاسے کی حاجت کو پانی پوری کردیتا ھے اور بھوکے کی حاجت کو روٹی، اس لئے یہ دولت ھیں ۔ اور اسی طرح دوسری تمام اقسام دولت کو قیاس کرلیجئے۔

انسان کی حاجتیں اور ضرورتیں بہت سی ھیں اور بڑی متنوع اقسام کی ھیں ۔ لیکن ھر ضرورت یکساں اھمیت کی حامل نہیں ھوتی۔ بعض بہت ھی اھم ھیں ۔بعض ان سے کم اور بعض بہت ھی کم اھمیت رکھتی ھیں ۔ اور اس کے بعد بعض ایسی بھی حاجتیں میں ھیں جو حقیقۃ حاجتیں نہیں بلکہ ھمارے جذبۂ نقالی، حرص اور ھماری حماقت و نارسائی فکر نے انھیں ضرورت و حاجت کا مرتبہ عطا کر دیا ھے اور ھم صرف حرص بلکہ اکثر دوسروں کی ریس کی وجہ سے ان غیر حقیقی ضروریات کی تکمیل کے لئے سرگرداں و پریشاں ھیں ۔

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب معاش
انچہ ما در کار دارم اکثرش درکار نیست

اس کی مثالیں پیش کرکے بات کو طولانی بنا دینے کی ضرورت نہیں ھے، ھر شخص خود اپنی ضروریات کا جائزہ لے کر اس کو اچھی طرح سمجھ سکتا ھے۔ اس جائزے کے بعد ھم جس نتیجہ تک پہنچتے ھیں وہ یہ ھے کہ ھماری ضروریات جسے ھم ضروریات کہتے ھیں پانچ اقسام کی ھیں ۔

(۱) ضروریات زندگی
(۲) ضروریات کارکردگی
(۳) ضروریات توانائی
(۴) اسراف
(۵) تبذیر

(۱) ضروریات زندگی مثلاً کھانا، پانی، کپڑا، مکان اور دوائیں وغیرہ یعنی وہ چیزیں جن کے بغیر ہم زندگی بسر نہیں کرسکتے۔ یا کم از کم مطمئن نہیں رہ سکتے، یہ ضروریات اصلی اور اہم ترین ضرورتیں ہیں۔

(۲) ضروریات کار کردگی، وہ تمام چیزیں جو مشغول بہ کار رہنے اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے ضروری ہیں مثلاً کاریگر کے اوزار عالم کی کتابیں، کاتب کا قلم، کاغذ اور روشنائی، مدارس کی عمارتیں وغیرہ۔

(۳) چونکہ ہم اپنی تمام حرکات میں اپنی توانائی کا ایک حصہ صرف کرتے ہیں، اس لئے ہمیں اس کی بھی ضرورت ہے کہ اپنی صرف شدہ توانائی کے بدلہ میں توانائی حاصل کریں۔ اس کو ضرورت توانائی، ضرورت عیش اور ضرورت تفریح کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔

ان تینوں اقسام کے علاوہ جو درجہ بدرجہ اپنی اپنی جگہ پر واقعی ضرورتیں ہیں، ہم دو قسم کی مزید ضرورتیں بھی اپنی زندگی میں پیدا کرلیتے ہیں۔ یہ در حقیقت ضرورتیں نہیں ہوتیں ہیں بلکہ ہم اپنی نادانی سے انہیں ضرورتوں کا درجہ دے لیتے ہیں، ان میں سے ایک ہے اسراف اور دوسری تبذیر۔

(۴) اسراف کے معنی ہیں حقیقی ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا۔ اگرچہ محل صرف حقیقی ہو مگر اس میں ہم حصول مقصود سے زیادہ صرف دولت کریں تو اسے اسراف کہا جائے گا۔ مثلاً غسل کرنا یا وضوء کرنا ہماری ایک حقیقی ضرورت ہے لیکن ایک شخص اگر غسل کے لئے پانی کی دس بالٹیاں بہائے یا وضوء کرتے ہوئے ہاتھ اور منہ کو سات سات مرتبہ دھوئے تو اس نے پانی کا اسراف کیا۔ ایک بار ایک صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ:

—— کیا وضوء میں اسراف ہوسکتا ہے؟ یا رسول اللہ!

—— آپ نے فرمایا، ہاں! اگرچہ تم بہتی ہوئی ایک ندی کے کنارے ہی پر کیوں نہ ہو۔

سائل کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ اگر مصرف خیر ہو اور حقیقی ضرورت میں کوئی چیز صرف کی جائے، پھر یہ کہ رسد بھی کافی ہو تو زیادہ خرچ کردینے کو کیوں معیوب قرار دیا جائے، اور آپ‌ؐ کے جواب میں یہ بات واضح کردی گئی کہ طلب سے زیادہ صرف اسراف ہے چاہے رسد کتنی ہی زیادہ ہو۔ طلب کو رسد کی بہتات کی وجہ سے بڑھا دینا جایز نہیں ہے، اگرچہ مصرف خیر ہے اور حقیقی بھی ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ رسد بہت ہی زیادہ ہے لیکن اگر طلب کو رسد کی بہتات کی وجہ سے بڑھا دیا جائے تو اس کو اسراف ہی کہا جائے گا اور اسراف کرنے والے کو اللہ تعالی پسند نہیں کرتا۔

اگر ہم اپنی طلب کو رسد کی فراوانی کے ساتھ ساتھ بڑھا کر اسراف کا گناہ نہ کریں تو ہمارے معاشرے کے سیکڑوں ہی امراض کا علاج ہو جائے۔

(۵) پانچویں اور سب سے زیادہ غیر حقیقی اور نقصان دہ ضرورت جو ہم نے پیدا کرلی ہے وہ تبذیر ہے۔ تبذیر کا لفظ ان تمام اعمال پر حاوی ہے جن سے مقصود کسی حقیقی ضرورت کی تکمیل نہیں ہوتی بلکہ ریا، طلب شہرت ناموری کی تمنا ، دوسروں کی ریس، محض برادری والوں کی خوشنودی اور اسی قسم کے ذلیل مقاصد سامنے ہوتے ہیں۔ اس میں مراسم کی پابندی کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔

اس پانچویں قسم کے اخراجات او صرف دولت کے اس بے جا مواقع سے لوگ بہت زیادہ تباہ حال رہتے ہیں اور معاشرے کو اس سے بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ انفرادی کردار و اعمال کو بھی تبذیر سے برے اور ناپاک رخ کی طرف مڑ جانے کا موقع مل جاتا ہے۔ کوئی خوشی اور غم کے مراسم ادا کرنے کو سودی قرضے لیتا ہے، کوئی جہیز کا سامان مہیا کرنے کے لئے رشوت سے اپنے ہاتھ رنگتا ہے۔ پھر دوسرے اس کی ریس کرتے ہیں اور گناہ کا یہ چکر سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ لوگوں میں بزدلی پیدا ہوجاتی ہے اور ان میں اتنی ہمت باقی نہیں رہتی کہ وہ گناہ کے اس چکر سے نکل

سکیں، اسی لئے اللہ تعالی نے تبذیر کرنے والوں کو شیطان کا بھائی قرار دیا ہے۔ جس طرح شیطان اک ذرا سی بے ضرر حرکت کرکے قتل و خون تک فساد برپا کرا دیتا ہے، بالکل اسی طرح تبذیر کے گناہ کا مرتکب ایک مبذر ایک بے ضرر سی حرکت کرکے سارے معاشرے میں فساد پیدا کردیتا ہے۔ مثلاً ایک شخص نے اپنی لڑکی کو بہت قیمتی اور بہت سا جہیز دیا۔ لیکن اس نے اس کی اہتمام کے ساتھ نمائش بھی کی۔ بہ ظاہر اس نے کسی کو نہ دکھ پہنچایا اور نہ کسی کو ستایا بلکہ دعوت دیکر لوگوں کو بلایا اور اچھی خاطر مدارات بھی کی۔ لیکن اس نے ساری آبادی میں ریس، رسم اور نمود و نمائش کی ایسی آگ لگا دی جس سے بہت سے گھر تباہ ہو جائیں گے۔ برادری والوں میں سے جو اتنا جہیز مہیا نہیں کرسکیں گے وہ رشک و حسد کی آگ میں جلیں گے اور جو اس سے بہتر جہیز مہیا کر سکیں گے وہ اس شخص کو اور دوسرے لوگوں کو ذلیل اور کمتر شمار کریں گے۔ اس طرح برادری میں احساس کمتری اور فخر و غزور کی دوھری آگ بھڑکے گی۔

اب سطور بالا کو نظر میں رکھ کر خطبۂ تبوک کے اس مختصر سے فقرے پر غور کیجئیے، اس میں ھماری زندگی کے لئے بہترین رھنمائی موجود ھے جس کے مطابق عمل کرکے ھم نہ صرف اپنی زندگی کو سنوار سکتے ھیں بلکہ سارے معاشرے کی اصلاح بھی کرسکتے ھیں۔ اس فقرہ میں ھمیں یہ بتایا گیا ھے کہ:-

جس مال و دولت کی مقدار اگرچہ کم ھو مگر ضرورت زندگی کے لئے کافی ھو وہ ایسے مال سے بہتر ھے جو اگرچہ بہت زیادہ ھو مگر ھمیں غفلت میں ڈال دے۔

اس طرح مال و دولت کی چار قسمیں ھوئیں۔

(۱) جو مقدار میں کم ھو اور حقیقی ضروریات کی تکمیل کے لئے کافی ھو،

(۲) جو مقدار میں کم ھو اور حقیقی ضروریات کی تکمیل کے لئے ناکافی ھو،

(۳) جو مقدار میں کثیر ہو اور ہمیں غفلت میں ڈال دے۔

(۴) جو بقدار میں کثیر ہو اور ہمیں غفلت میں نہ ڈال سکے،

ان میں سے قسم اول قسم سوم سے بہتر ہے۔ اور یہ چیز بھی پیغمبرانہ حکمت نے واضح کردی کہ مال و دولت کی کوئی مقدار چاہے قلیل ہو یا کثیر نہ خیر ہوتی ہے اور نہ شر، خیر و شر ہونے کا تعلق دولت کی دوسری صفات سے ہے جیسے کافی ہونے اور غفلت میں ڈال دینے سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ہر دولت قلیل خیر نہیں ہوتی بلکہ وہ خیر ہوتی ہے جو کسی کی حقیقی ضروریات کی تکمیل کے لئے کافی ہو، اور ہر دولت کثیر، شر بھی نہیں ہوتی بلکہ وہ دولت کثیر شر ہوجاتی ہے جو صاحب دولت کو اپنی محبت میں مبتلاء کرکے فرایض انسانی سے غافل بنا دے۔ اگر کسی صاحب دولت کثیر، میں خالق کائنات، اس کے احکام اور اس کی رضا جوئی کی طرف سے غفلت نہیں طاری ہوتی تو اس کی دولت نعمت پروردگار ہے اور خیر کامل ہے جس کے ذریعہ سے وہ دنیا اور آخرت کی خوشی حاصل کرسکتا ہے۔ عشرۂ مبشرہ صحابۂ کرام میں سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بھی صاحب دولت کثیر تھے اور حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے پاس بھی بڑی دولت تھی لیکن ان بزرگوں پر غفلت کبھی طاری نہ ہوسکی، اور نہ دولت کی محبت ان کے دل میں جگہ پاسکی۔ اس لئے ان کی دولت نعمت پروردگار اور خیر کامل تھی - باوجود کثرت کے اس سے بہتر کوئی مال نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح کم دولت جو اصلی و حقیقی ضروریات کے لئے بھی کافی نہ ہو، خیر نہیں ہوتی بلکہ اکثر شر ثابت ہوتی ہے۔ آدمی بھکاری اور ذلیل ہوجاتا ہے جس کی طرف اس سے پہلے والے فقرہ میں اشارہ کیا جاچکا ہے شاید اسی مقصد کے ماتحت خطبہ میں ان فقروں کی ترتیب آپ نے قائم فرمائی تھی۔ بلکہ آپ نے ایک موقع پر فقر اور بے زری کو کفر تک پہنچا دینے والا ایک خطرہ بھی قرار دیا ہے۔

دولت کی فراوانی کس طرح غفلت بلکہ بے راہ روی پیدا کردیتی ہے اس کی مثالیں ہر زمانہ اور ہر ملک میں بے شمار مل جاتی ہیں ۔ اخباروں میں اطلاعات شایع ہوتی رہتی ہیں کہ فلاں کڑورپتی نے محفل رقص و سرود منعقد کرنے کے لئے دو لاکھ روپے دئے اور فلاں لکھ پتی نے مقابلۂ حسن کے لئے لاکھوں روپے کا عطیہ دیا ۔

اس طرح اس کی بھی اطلاع ملتی ہے کہ فلاں دولتمند نے یتیم خانہ بنوایا ۔ تعلیم کے لئے غریب طلبہ کو وظیفے دیے ۔ دواخانہ اور ہسپتال قایم کیے یہ ضروری نہیں کہ اس نے یہ خیرات ناموری ہی کے لیے دی ہو بلکہ اکثر صورتوں میں ایسی خیرات اللہ تعالی کی رضا جوئی کے لئے بھی ہوتی ہے ۔

اس طرح کسی دولت کے خیر و شر ہونے کا معیار اس کی قلت و کثرت نہیں ہے بلکہ اس کا کافی ہونا اور غفلت پیدا کرنا ہے ۔

اسلام میں حلال ذریعہ سے بقدر کفاف روزی کمانے کی کوشش کو عبادت قرار دیا گیا ہے قرآن مجید میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کا جو طریقۂ زندگی سورہ الفتح کی آیت (۲۹) میں بتایا گیا ہے اس میں رکوع اور سجدہ کے بعد ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالی کی دی ہوئی دولت اور اس کی رضا مندی کی تلاش کرتے ہیں اسی طرح اور متعدد آیتوں میں بھی حلال ذرائع سے رزق کی تلاش کا حکم موجود ہے ۔ کافر کی تلاش دولت اور موسن کی تلاش دولت میں یہ بنیادی فرق ہے کہ کافر تلاش دولت میں مقصود خود دولت ہی کو سمجھتا ہے اور موسن تلاش دولت کی مہم سے مقصود اللہ تعالی کے حکم کی تعمیل اور اس کی رضا کے حصول کو قرار دیتا ہے ۔

دولت کے خیر و شر ہونے کی یہ ساری بحث صرف اس دولت کے متعلق ہے جو حلال ذرائع سے حاصل کی گئی ہو، ورنہ حرام ذرائع ،مثلاً چوری، ڈاکہ،

قمار بازی، سود خواری، خمر فروشی، ذخیرہ اندوزی اور نفع خوری وغیرہ سے حاصل ہونے والی دولت میں خیر کا کوئی پہلو تلاش کرنا عبث ہے۔ فطرت انسانی اور عقل سلیم اس کے شر ہونے پر متفق ہے۔ یہ شر ہے اور ہر جگہ اور ہر زمانہ میں شر ہی رہے گی چاہے ہماری کم نظری کی وجہ سے کسی وقت کار آمد ہی کیوں نہ نظر آئے۔ ناجایز ذرائع کسب کے متعلق نظر کو دھوکہ صرف اس لئے ہوتا ہے کہ ہم اس کے دور رس اثرات اور نتائج کی طرف سے آنکھیں بند کرلیتے ہیں۔ ورنہ ذرا سی توجہ سے اس کے نقصانات واضح ہو جاتے ہیں۔

ذرایع حصول دولت کے اعتبار سے ہمارے سامنے اموال کی تین قسمیں آتی ہیں۔

قسم اول :۔ حلال یعنی حلال ذریع سے حاصل کیا ہوا مال۔ ایسے مال کا بھی قیامت کے دن حساب دینا پڑے گا۔ قیامت میں اور سوالات کے علاوہ اس سؤال کا جواب ہم سب کو دینا ہی پڑے گا کہ جو مال ہم نے حلال ذریعہ سے حاصل کیا تھا، اس کو خرچ کیا یا نہیں کیا، اور خرچ کیا تو کن مصارف میں خرچ کیا،

قسم دوم :۔ مشتبہ یعنی وہ مال جس کے حلال ہونے میں شک و شبہ ہو، ایسے مال مشتبہ کہا جاتا ہے۔ ایسے مال سے احتراز ضروری ہے کیوں کہ قیامت میں اس کا مواخذہ ہوگا اور اللہ تعالی کے عتاب سے بندہ کو دوچار ہونا ہی پڑے گا۔

قسم سوم :۔ حرام یعنی وہ مال جو حرام اور ناجایز ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو، اس مال کے مالک پر خدا کا عذاب نازل ہوگا۔ اور ایسا بندہ عذاب میں ضرور ڈالا جائے گا۔

قیامت کے دن کا حساب ہی کیا کم مصیبت ہے کہ عتاب و عذاب کی کیفیت کا کوئی اندازہ کیا جا سکے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ عتاب کی کیا صورت ہوگی اور عذاب کتنے دردناک ہونگے اس جگہ ایک بندۂ مومن کو یہ خیال آسکتا ہے کہ موت کے وقت توبہ کرلیں گے۔ اس لئے خطبۂ تبوک میں اس فقرہ کے بعد ہی آپ نے فرمایا۔

(۱۷) شر المعذرة حين يحضر الموت۔

انتہائی بری عذر خواہی (توبہ) اس وقت کی توبہ ہے جب موت سامنے آجائے۔

یہ فقرہ قرآن مجید کی آیت ۱۷ - ۱۸ سورۂ النساء کے مطابق ہے۔ اللہ تعالی نے فرمایا ہے:-

انما التوبة على الله للذين يعملون السوء بجهالة ثم يتوبون من قريب فاولئك يتوب الله عليهم وكان الله عليماً حكيما۔

جس توبہ کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ ہے وہ صرف ان لوگوں کی توبہ ہے جو نادانی سے برا کام کر بیٹھتے ہیں پھر قریب ہی وقت میں توبہ کرلیتے ہیں، تو یہی لوگ ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے، اور اللہ صاحب علم و حکمت ہے۔

و ليست التوبة للذين يعملون السيات حتى اذا حضر احدهم الموت قال إني تبت الآن و لا الذين يموتون وهم كفار، اولئك اعتدنا لهم عذاباً اليما۔

توبہ ان لوگوں کے لئے نہیں ہے جو برے کام کرتے رہتے ہیں حتی کہ جب موت ان میں سے کسی کے سامنے آجاتی ہے تو کہتے ہیں کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ ان لوگوں کے لئے (توبہ) ہے جو کفر ہی کی حالت

میں مرجاتے ہیں، یہ ہیں وہ لوگ
جن کے لئے ہم نے دردناک عذاب
تیار کر رکھا ہے۔

توبہ کے معنی ہی یہ ہیں کہ ایک شخص کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے خالق کے حضور عاجزی کے ساتھ اس کا اقرار کیا کہ وہ پھر ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ موت کو سامنے پاکر توبہ کیا توبہ ہوئی، اس وقت تو مرنے والے کو اس کا یقین ہوجاتا ہے کہ اب وہ دنیا میں نہیں رہے گا۔ اس یقین کے بعد اس اقرار کے کیا معنی باقی رہ جاتے ہیں کہ اب آیندہ یہ غلطی نہیں کرے گا۔ اسے تو یہ یقین حاصل ہوچکا کہ اب وہ نہ غلط عمل کرسکے گا اور نہ صحیح ۔کسی قسم کا عمل کر ہی نہیں سکتا تو آیندہ کے کسی عمل کے کرنے یا نہ کرنے کا اقرار محض دل بہلانے کی باتیں ہیں ۔ اس سے زیادہ اس کی اور کوئی حیثیت نہیں ۔ رہا یہ خیال کہ خداوند تعالی بڑا رحیم و غفور ہے۔ شاید موت کے وقت کی توبہ بھی قبول فرمالے بلکہ یہ امید کہ اللہ تعالی قبول کرلے گا، امید کی ایک کرن ضرور ہے مگر کسی کا موت کے وقت توبہ کرنا توبہ کی یقیناً سب سے بری قسم ہے۔

آدمی کو چاہئے کہ جس وقت گناہ کا احساس ہوجائے فوراً توبہ کرلے اور سچے دل سے اپنے خالق کے حضور میں اس کا عہد کرے کہ وہ آیندہ گناہ نہیں کرے گا۔ موت کے وقت تک انتظار کرنا اور گناہ کی زندگی بسر کرتے رہنا اللہ تعالی کی رحمت اور اس کی غفاری کے ساتھ استہزاء اور مذاق کے برابر ہے ۔ پھر یہ کسے معلوم ہے کہ موت کے وقت توبہ کی فرصت میسر آئے گی یا نہیں آئے گی۔ ہزاروں آدمی طبعیاتی حوادث کے شکار ہوجاتے ہیں ۔ ہزاروں کو اچانک موت آجاتی ہے ۔ ہزاروں بمباری میں مرجاتے ہیں، اور ہزاروں ہی بیہوشی اور سکتہ کے بعد دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں ۔ انہیں کہاں موقع ملتا ہے کہ توبہ کرکے دنیا سے جائیں ۔

توبہ کرنے کے اخروی فواید تو ہمیں مرنے کے بعد ہی حاصل ہوسکتے ہیں لیکن توبہ کا دنیوی فائدہ یہ ہے کہ ہمیں توبہ کے بعد اپنی زندگی کو زیادہ بہتر سانچہ میں ڈھالنے اور عقاید و اعمال کو سنوارنے کا موقع میسر آجاتا ہے۔ یہ فائدہ موت کے وقت کی توبہ سے کس طرح حاصل ہوسکتا ہے۔ یہ تو زندگی کے اختتام کے وقت کی جاتی ہے۔ اب آیندہ زندگی ہے کہاں جسے ہم بہتر سانچہ میں ڈھالیں اور سنوار کر اچھی زندگی بنائیں۔

(۱۸) وشر الندامة يوم القيامة  اور سب سے بری ندامت وہ ہے جو قیامت کے دن ہوگی۔

جب کوئی شخص کوئی برا کام کر بیٹھتا ہے تو اسے دنیا میں ندامت ہوتی ہے بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ وہ روپوش ہوجاتا ہے۔ اپنا وطن چھوڑ کر کہیں دور دراز مقام پر اقامت پذیر ہوجاتا ہے جہاں کے لوگ اس کے برے کام سے واقف نہ ہوں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ندامت کی شدت میں وہ خودکشی کر بیٹھتا ہے۔ ایسے واقعات ہر روز ہوتے رہتے ہیں اور ہر ملک و ہر معاشرے میں ہوتے رہتے ہیں۔

اب ذرا قیامت کے میدان کا تصور کیجئے جہاں سے روپوشی بھی ممکن نہیں اور جس میدان میں خودکشی بھی نہیں کی جاسکتی۔ جہاں ہماری ذلت و رسوائی کے دیکھنے کو ساری اولاد آدم موجود ہوگی جہاں ہمارے باپ دادا بھی ہوں گے۔ ہم کو اچھا سمجھنے والے دوست اور احباب بھی ہوں گے، ہمیں اپنا بزرگ اور بڑا ماننے والے ہمارے بچے، اور پوتے پوتیاں بھی ہوں گی۔ ہمیں نیکوکار اور ولی اللہ جاننے والے شاگرد اور عقیدت مند بھی ہوں گے، اس میدان میں ندامت سے ہم عرق عرق ہوں گے۔ اور اپنا گناہگار چہرہ کسی سے چھپا بھی نہ سکیں گے۔

اللہ کی پناہ! کیسی ندامت ہوگی اور کتنی بری ندامت ہوگی۔

قبر کی مٹی میں یاں تو عیب سارے چھپ گئے
حشر کی محفل میں رسوائی سے کیونکر ہو نجات

(۱۹) و من الناس من لا یاتی الجمعة الادبرا۔ — اور کچھ لوگ وہ ہیں جو جمعہ میں نہیں آتے مگر بڑی دیر سے۔

(۲۰) ومن لا یذکر اللہ الا هجرا۔ — اور کچھ وہ لوگ ہیں جو اللہ کو نہیں یاد کرتے مگر کبھی کبھی

ان دو فقروں کو ایک ساتھ ملاکر اس لئے بیان کیا گیا کہ ان دونوں کا تعلق آدمی کی ایک ھی نفسی کیفیت سے ھے۔ آدمی کی کیفیت یہ ھے کہ جس مقصد کو وہ جس قدر عزیز رکھتا ھے اسی قدر اس کی یاد اس کے دل میں قایم رھتی ھے۔ اور اس کے حصول کے لئے وہ اسی قدر اھتمام کے ساتھ عمل کرتا ھے۔ اس سلسلہ میں سستی و بے پرواھی کا اس سے ظہور نہیں ھوتا۔ مثال کے طور پر ایک امیدوار کو دیکھئے جب اسے بہ سلسلۂ تقرر ملاقات کے لئے بلایا جاتا ھے تو حتی الامکان وہ مقررہ وقت سے دو چار منٹ پہلے ھی حاضر ھوجاتا ھے۔ لیکن جب اس کا تقرر کسی عہدہ پر ھوجاتا ھے تو چند دنوں کے بعد ھی اس کا یہ حال ھوجاتا ھے کہ دیر سے دفتر میں حاضر ھونا تقریباً معمول بن جاتا ھے۔ اسی طرح وہ آدمی جسے کسی مقدسہ میں حاضر ھونا ھوتا ھے حتی الامکان کبھی دیر سے نہیں آتا۔ امتحان ھال میں طلبہ کی حاضری اور مسافروں کی ریلوے اسٹیشنوں پر موجودگی پر غور کیجئے تو یہ کلیہ آسانی سے سمجھ میں آجاتا ھے کہ دیر سے حاضر ھونے والے کا ذھن در حقیقت کام اور مقصد کی طرف سے غافل ھوتا ھے۔ ورنہ انسان ھر اس موقع پر قبل از وقت حاضری کی کوشش کرتا ھے جہاں پر حاضر ھونا اسے اھم نظر آتا ھے یا وھاں پر حاضری سے اس کے قلب و دماغ کو مسرت و طمانیت حاصل ھوتی ھے۔

اب سوچئے کہ جو شخص جمعہ کے لئے ھمیشہ ھی بڑی دیر سے آیا کرے

اس کے دل و دماغ کی کیفیت کیا ہوگی، اور جمعہ کی حاضری اس کو کس قدر جبر اور کتنی غیر اہم نظر آتی ہوگی۔

اسی نفسی کیفیت کو دوسرے فقرہ میں اس طرح ظاہر کیا گیا ہے کہ ''کچھ وہ لوگ ہیں جو اللہ کو نہیں یاد کرتے مگر کبھی کبھی'' یہاں اللہ کی یاد سے مراد کوئی ذکر جلی یا ذکر خفی نہیں ہے۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ کسی کسی وقت ان کو اللہ تعالی اور اس کی طرف سے عاید کئے ہوئے فرایض یاد تو آتے ہیں مگر وہ ہمیشہ یہ یاد نہیں رکھتے کہ اس وقت اور اس موقع کے لئے اللہ تعالی کا حکم کیا ہے۔ ورنہ وہ غفلت میں مبتلاء نہ ہوجاتے اور صحیح وقت پر بلکہ دوچار منٹ پہلے ہی جمعہ کے لئے حاضر ہوجاتے۔ اللہ تعالی کا حکم یہی ہے کہ جب جمعہ کے دن نماز کے لئے پکارا جائے تو کاروبار کو چھوڑ دو اور اللہ کی یاد کی طرف تیزی سے چل پڑو۔

جس وقت کے لئے اللہ تعالی کا جو حکم ہے اسے بر وقت بجالانے کا نام عبادت ہے۔ مثلاً رمضان کے دنوں میں کھانے پینے سے رک جانے اور روزہ رکھنے کا حکم ہے۔ اور عید کے دن کھانے کا حکم ہے اسلئے رمضان میں روزے عبادت ہیں اور عید کے دن کھانا عبادت ہے۔

آدمی کے لئے بھلائی اسی میں ہے کہ ہر وقت اللہ کو یاد رکھے۔ جس وقت کے لئے جو حکم ہے اسے بجالائے۔ اللہ تعالی کی یاد سے ایک لحظہ کی غفلت انسان کو دنیا اور آخرت دونوں جگہ محرومی کا شکار بنا دیتی ہے۔ دنیا میں اسے قدم قدم پر ناکامی سے واسطہ پڑتا ہے اور آخرت میں شدید مؤاخذہ سے دوچار ہونا پڑے گا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہزاروں آدمی مختلف قسم کے گناہ کرتے اور اس کے نتایج اور سزا سے محفوظ بھی رہ جاتے ہیں۔ نہ انھیں فوراً کوئی تکلیف پہنچتی ہے اور نہ انھیں قانونی و عدالتی سزاؤں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

ہزاروں چوریاں چھپ جاتی ہیں اور چوروں کو کسی قسم کی سزا سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ ہزاروں قاتل ایسے ہیں جن کے خلاف کوئی مقدمہ بھی قایم نہیں ہوتا۔ اسی طرح اور ہر قسم کے گناہ، ظلم اور ستم کو دیکھئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خالق کائنات نے ان کی سزاؤں کے لئے حیات مابعدالموت کا زمانہ متعین کر رکھا ہے۔ قرآن مجید میں بار بار یہ یاد دلایا گیا ہے کہ ”عنقریب تم غیب و شہود کا علم رکھنے والے مالک کے سامنے حاضر کئے جاؤ گے جہاں تمہارے جرایم چھپائے نہیں جاسکیں گے اور تم کو اپنے برے اعمال کے لئے دردناک عذابوں میں مبتلا ہونا پڑے گا“۔

چونکہ زندگی موت پر ختم نہیں ہوجاتی بلکہ صرف دوسرے مرحلہ میں داخل ہوجاتی ہے اس لئے اگر کوئی مجرم اپنی اس زندگی میں سزا نہیں پاتا تو زندگی کے دوسرے مرحلہ میں سزا سے نہیں بچ سکے گا۔ اسے ضرور سزا ملے گی۔ اگر اسے کہیں بھی سزا نہ ملے تو دنیا میں ہمیں جو عمل اور مکافات عمل کا قانون کار فرما نظر آتا ہے ، سارا ہی بے معنی ہوکر رہ جائے۔

غفلت شاید قانون فطرت میں سب سے بڑا گناہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس گناہ کے مرتکب کو یہاں دنیاوی زندگی میں بھی سزا ملتی ہے اور آخرت میں بھی سزا ملے گی۔ غفلت کا گناہ جس مقام سے اور جس انداز کا ہوگا اس کے دنیاوی اثرات بھی اسی انداز کے ہوں گے۔ مثلاً کوئی شخص دروازے میں داخل ہوتے ہوئے غفلت کا گناہ کرے تو فوراً اس کے سر میں چوٹ لگ جائے گی۔ اگر کوئی آدمی غذا اور لباس میں غفلت کا گناہ کرے تو اپنی صحت کھو بیٹھے گا۔ اسی طرح ایک محلہ اور ایک شہر والے صفائی سے غافل ہو جائیں تو محلّہ اور شہر میں وبا پھیل جائے گی۔ غفلت جب اتنا سنگین گناہ ہے تو اس کم نصیب کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے جو خالق کائنات ہی کی طرف سے غافل ہو جائے۔ اس کی خوشی کتنے منٹ قایم رہ سکے گی اور مرنے کے بعد اس کا کیا حال ہوگا۔

(۲۱) ومن اعظم الخطایا اللسان الکذاب۔ اور بہت بڑے گناھوں میں سے ھے جھوٹ بولنے والی زبان۔

بڑے بڑے گناہ اور خطائیں تو اور بھی ھیں لیکن ان گناھوں میں سے ایک بڑا گناہ جھوٹ بولنا ھے۔ جھوٹ کس قدر بری چیز ھے اس کے بیان کی ضرورت ھی کیا ھے۔ اس کی برائی اور برے نتائج فطرت انسانی کے نزدیک ایک تسلیم شدہ حقیقت ھے۔ اس جگہ خطبہ میں اس فقرہ کا مطلب یہ ھے کہ جمعہ میں دیر سے آنے کی وجہ اگر کسی سے پوچھی جائے تو عام طور سے لوگ جھوٹے بہانے کردیتے ھیں جو ایک بہت بڑی خطا ھے۔ اپنے زمانہ میں آپ اس کا نمونہ دیکھنا چاھیں تو کسی جلسہ میں صدر صاحب یا مقرر صاحب سے دیر میں آنے کا عذر سنئے۔ یا کسی دفتر میں دیر سے آنے والے اھلکار حضرات کا عذر اپنے افسروں کے سامنے دیکھئے۔

(۲۲) و خیر الغنی غنی النفس۔ اور بہترین بے نیازی نفس کی بے نیازی ھے۔

انسان کے احتیاجوں کی کوئی حد و شمار نہیں، وہ مال و دولت کا ھی نہیں بلکہ اور بھی بہت سی چیزوں کا محتاج ھے۔ اتنی چیزوں کا محتاج ھے کہ وہ اپنی ساری زندگی ان احتیاجوں کی تکمیل کے لئے جدوجہد میں صرف کردیتا ھے، اور اس کے بعد بھی یہی کہتا ھے کہ:

ہزاروں خواھشیں ایسی کہ ھر خواھش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اور مال و دولت کے لئے تو ھم دن رات پاپڑ بیلتے ھی رھتے ھیں اور اس کے بعد بھی کسی مرحلہ پر ھم میں غنا کی کیفیت پیدا نہیں ھوتی۔ ھمیشہ ننانوے کے چکر میں گرفتار رھتے ھیں کہ اب صرف ایک اور مل جائے تو سو ھوجائے اور سو کے بعد دوسرے سو کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ھیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم زندگی میں اطمینان اور مسرت سے محروم رہتے ہیں ۔ حرص اور لالچ زندگی بھر ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ اور مرتے دم یہ کیفیت ہوتی ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر چلے جانے کی حسرت دل میں لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہوتے ہیں ۔

اس فقرہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر دولت دنیا کی بڑی سے بڑی مقدار بھی ہم مہیا کرلیں تو ہمیں خوشی کی زندگی اس وقت تک میسر نہیں آسکتی جب تک کہ ہمیں نفس کا غنی حاصل نہ ہوجائے۔ جب انسان کے دل میں بے نیازی کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے تو خوشی کے لمحات بڑھ جاتے ہیں ۔ یہ نہیں کہ وہ دولت دنیا کے حاصل کرنے کی سعی سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے ۔ وہ محنت کرتا ہے ۔ دولت کماتا ہے مگر اپنے دل کو اس سے اتنا وابستہ نہیں کردیتا کہ حرص پیدا ہوکر اس کے قلبی سکون اور اطمینان کو غارت کردے ۔ وہ حصول مال کی پوری جدوجہد کو اللہ کے حکم کی تعمیل اور اس کے فضل و رضوان کی تلاش قرار دیتا ہے ۔ وہ اپنی جدوجہد میں تقویٰ کے حدود کو نہیں توڑتا ہے ۔ وہ مطمئن رہتا ہے اور خوشگوار زندگی بسر کرتا ہے ۔ جو کچھ وہ حاصل کرتا ہے وہ ان طریقوں سے حاصل کرتا ہے جو اللہ تعالی کے نزدیک پسندیدہ طریقے ہیں ۔ اور جب اپنے مال کو خرچ کرتا ہے تو ان مصارف میں خرچ کرتا ہے جن کو اللہ تعالی کی خوشنودی کا پروانہ حاصل ہے ۔

(۲۳) و خیر الزاد التقوی ۔ اور بہترین زاد سفر تقوی ہے ۔

ہماری حیات کیا ہے ؟ ایک سفر اور مسلسل سفر۔ اس مادی زندگی کی پستی سے حیات لازوال کی بلندی کی طرف، ہم پیدایش سے موت تک سفر کا ایک حصہ طے کرتے ہیں اور موت کے بعد سے قیامت اور جنت تک دوسرا حصہ۔ ہمارے اس سفر کی منزل مقصود جنت ہے ۔ سفر کے ان دونوں حصوں میں ہمیں زاد راہ اور توشہ کی ضرورت ہے ۔ ہمیں اپنی دنیاوی زندگی میں یہ موقع

حاصل ہے کہ اپنے سفر کے ہر دو حصوں کے لئے زاد راہ اور کافی توشہ حاصل کرلیں ۔ سفر کے دوسرے حصہ میں اس کے حصول کی کوئی صورت ممکن نہیں رہے گی۔ بڑی نادانی ہوگی کہ ہم زاد سفر مہیا کرنے سے غافل رہیں ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فقرہ میں یہ بتایا ہے کہ بہترین زاد سفر تقوی ہے ۔ اسی خطبہ کے دوسرے فقرہ میں تقوی کو سب سے مضبوط کڑی سے تشبیہ دی ہے ۔ مطلب یہ تھا اگر کسی نے تقوی کی مضبوط کڑی کو تھام لیا تو اس کے پھسل کر گرجانے کا خطرہ باقی نہیں رہا ۔ اب اس فقرہ میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص تقوی کی حدود میں رہ کر مال حاصل کرے گا۔ اور تقوی کے حدود کے اندر ہی اسے خرچ بھی کرے گا تو یہ عمل آدمی کے لئے بہترین زاد سفر ثابت ہوگا، سفر کے دونوں حصوں کے لئے ۔ دنیا میں اسے اطمینان اور خوشی حاصل رہے گی اور موت کے بعد بھی وہ خوش اور مطمئن رہے گا۔ تقوی ایک نفسی کیفیت کا نام ہے جس میں آدمی اپنے ہر قول و عمل کا محتسب بن کر یہ دیکھتا ہے کہ اللہ تعالی کے بتائے ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سکھائے ہوئے حدود سے کہیں تجاوز تو نہیں کرگیا ۔ اس سے آدمی کے دل کو یہ اطمینان و خوشی حاصل رہتی ہے کہ اس نے کوئی جرم یا نافرمانی کا ارتکاب نہیں کیا ۔ اس طرح ایک متقی شخص کو دونوں قسم کے خوف و ہراس سے نجات مل جاتی ہے ۔ نہ اس میں مجرمانہ ذہن کی کیفیت ہوتی ہے اور نہ اس سے اس بات کا خوف باقی رہتا ہے کہ سفر کے آیندہ حصہ میں وہ زاد راہ سے خالی اور بےسہارا رہ جائے گا۔

(۲۳) و رأس الحکمة مخافة اللہ عزو جل ۔ اور دانائی کا سب سے اونچا درجہ اللہ عزوجل سے ڈرتے رہنا ہے ۔

دانائی اور حکمت اسے کہتے ہیں کہ جو قدم اٹھایا جائے وہ صحیح وقت اور صحیح مقام پر ہو اور پوری طرح سے سوچ بچار کے بعد اٹھایا جائے۔ ہر قدم مقصود متعین کی طرف اٹھایا جائے اور قبل ہی سے یہ بھی دیکھ لیا جائے

کہ اس کے کیا نتایج برآمد ہوں گے۔ اس حکمت اور دانائی کا سب سے بلند درجہ یہ ہے کہ آدمی یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اپنے دل و دماغ کو خوف الہی سے کسی وقت خالی نہ ہونے دے۔ اگر اللہ کے خوف سے دل خالی ہوا تو یہ عمل بہ ظاہر اور وقتی طور پر حکمت و دانائی تو نظر آسکتا ہے مگر یہ کوئی اونچے درجہ کی حکمت نہ ہوگی۔ مثلاً کسی نے قمار بازی میں یا ریس کے گھوڑوں پر رقم لگائی اور بڑی دانائی سے لگائی، اور اس نے کچھ رقم جیت بھی لی۔ لیکن چونکہ یہ خوف الہی سے خالی دل و دماغ کی پیدا کردہ دانائی و حکمت تھی، اس لئے اس کی نظر اس عمل کے وسیع نقصانات تک نہیں پہنچ سکی۔ اس عمل کو اونچے درجہ کی حکمت و دانائی نہیں کہا جا سکتا۔ اعلی درجہ کی دانائی تو اس وقت ہوتی جب کہ وہ اس عمل کے سارے ہی اثرات پر غور کرنے کے بعد کوئی قدم اٹھاتا۔ سود خواری اور قمار بازی وغیرہ وہ مجرمانہ اعمال ہیں جن کے نقصانات سارے معاشرے کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اور آخرت میں سود خوار اور قمار باز پر جو عذاب ہوگا اس کا کوئی اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا ہے۔

اس لئے ہر وقت اللہ عزوجل سے ڈرتے رہنا ہی اصل حکمت و دانائی ہے۔ اللہ تعالی عزوجل کے دو قسم کے احکام و قوانین کائنات میں جاری ہیں۔ ایک تو تکوینی قوانین ہیں مثلاً آگ جلاتی ہے۔ پانی ٹھنڈا کرتا ہے۔ آفتاب حرارت و توانائی مہیا کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے تشریعی قوانین ہیں مثلاً کم تولنا گناہ ہے۔ سود خواری ناجایز ہے، قمار بازی حرام ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ان دونوں قسموں کے احکام و قوانین کو نظر میں رکھنا اور اللہ کا خوف دل میں قایم رکھنا اصل دانائی ہے۔ جیسے تکوینی قوانین کی خلاف ورزی کرنا حماقت و نادانی ہے بالکل اسی طرح تشریعی قوانین کی خلاف‌ورزی بھی حماقت و نادانی ہے۔ نتایج و اثرات دونوں قسم کی حماقتوں سے برے ہی نکلتے ہیں۔ یہ ہماری نادانی ہے کہ ہم تکوینی قوانین کے اثرات کو دیکھ لیتے

ہیں اور تشریعی قوانین کے اثرات پر غور کرنے سے جی چراتے ہیں۔ ورنہ چوری، قمار بازی اور سودخواری کے اثرات، آتش زدگی، سیلاب اور آندھیوں کے نقصانات سے کم تر نہیں ہوا کرتے۔

(۲۰) وخیر ما وقر فی القلوب الیقین۔ اور بہترین چیز جو دلوں میں جاگزین ہو یقین ہے۔

آدمی کے دل میں نہ جانے کتنے ہی قسم کے خیالات آتے ہیں۔ شک و شبہ، وسوسہ، خوف، غم، خوشی، لاپرواہی، غفلت، دل میں کیا نہیں آتا۔ لیکن ان میں سے کوئی چیز اگر قلب انسانی میں جگہ پکڑ لے تو زندگی اجیرن ہوجائے۔ ان سب کے برخلاف اگر یقین محکم دل میں جاگزین ہو تو آدمی کو اطمینان اور قوت حاصل ہوجاتی ہے۔ کسی آدمی کے لئے بے یقینی کی کیفیت سے زیادہ مضر اور تکلیف دہ کوئی اور کیفیت نہیں ہوسکتی، اس سے آدمی کا حوصلہ پست، ارادہ کمزور اور دل اداس ہوجاتا ہے۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا، شدید قسم کا احساس کمتری طاری ہوجاتا ہے۔ ہر شخص خود اپنی حالت پر غور کرکے یہ معلوم کرسکتا ہے کہ پہلے علم حاصل ہوتا ہے، اس کے بعد یقین دل میں جاگزین ہوتا ہے۔ پھر یقین ارادہ پیدا کرتا ہے اور ارادہ اعضا و جوارح کو عمل کے لئے حرکت میں لاتا ہے۔ دنیا میں کسی ذی ہوش آدمی کا کوئی ارادی عمل ایسا نہیں ہوسکتا جس کے پیچھے اس کا یقین محرک کی حیثیت سے کار فرما نہ ہو۔ اس کائنات میں انسانی اعمال کا سارا نظام یقین سے وابستہ ہے۔ آدمی جو کچھ کرتا ہے اپنے یقین ہی کے ماتحت کرتا ہے۔ یقین نہیں تو آدمی کا کوئی قدم قوت کے ساتھ نہیں اٹھ سکتا۔ ایک بچہ اپنی ماں کی صداقت پر یقین کامل رکھنے ہی کی وجہ سے اپنی بہن کو بہن اور اپنے بھائی کو بھائی تسلیم کرتا ہے۔ ایک مریض اپنے طبیب پر یقین ہی کی وجہ سے اس کی دی ہوئی دوائیں استعمال کرتا ہے۔ ایک ملازم اپنے افسر کے

بیان پر یقین ہی کی وجہ سے نوکری بجالاتا ہے۔ ایک طالب علم اپنے استاد کے علم پر یقین ہی کی وجہ سے کچھ سیکھتا ہے۔

ان سب سے زیادہ محکم یقین ہمارا اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ہے، ان ہی کے فرمانے سے ہم نے قرآن مجید کو اللہ تعالی کی نازل کی ہوئی کتاب مانا ہے۔ ان ہی کے ذریعہ ہمیں حق و باطل کے مابین تمیز حاصل ہوئی ہے۔ تعلیمات نبوی کو چھوڑ کر برائی بھلائی اور خیر و شر کے مابین امتیاز کا کوئی معیار اگر ہم زندگی بھر تلاش کرتے رہیں تو بھی نہ پاسکیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی آدمی اپنی ماں کے بیان کو سچ مانے بغیر باپ، دادا، ماموں اور خالہ، کسی سے رشتہ نہیں قایم کرسکتا۔ کتنی بےعقلی اور نادانی ہے کہ طبیب کی صداقت پر یقین کرکے ہم اپنی جان تو اس کے حوالہ کر دیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے فرمان میں طرح طرح کے مین میکھ نکالنے لگیں۔

انسان کو اپنی حیات کے ہر ہر قدم پر یقین کی ضرورت ہے، یقین نہیں تو کچھ بھی نہیں، اس کے بغیر نہ ہم قلبی اطمینان پاسکتے ہیں اور نہ ہمارا کوئی قدم مضبوط ہوسکتا ہے۔ اس طرح ہم نہ دنیا کے رہتے ہیں اور نہ دین کے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی کے دل میں جاگزیں ہونے والی ہر چیز سے بہتر یقین ہے۔

(۲۶) وِ الارتیاب من الکفر۔ اور شک و شبہ کفر کی ایک قسم ہے۔

کفر کے لغوی معنی ہیں، اندھیرا۔ اصطلاحاً یہ لفظ دین اسلام سے انکار یا عدم قبول حق کے لئے بولا جاتا ہے۔ عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے اس کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کفر دون کفر یعنی ایک کفر دوسرے کفر سے کم و بیش بھی ہوتا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ عقیدہ

پایہ عمل کفر ہے تو یہ ضروری نہیں کہ ہر صورت میں اس عقیدہ یا عمل والا انسان حلقۂ اسلام سے مطلقاً خارج ہوگیا۔ بلکہ اکثر صورتوں میں اس کا مطلب صرف اس قدر ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ یا یہ عمل اسلام کے موافق نہیں ہے، بلکہ کفر کے موافق ہے، یا یہ کہ ایک صاحب ایمان مسلمان کے عقیدہ و عمل سے اس کا کوئی توافق ممکن نہیں۔

اس فقرہ میں کفر سے لغوی اور اصطلاحی دونوں معنی مراد ہیں۔ اگر کوئی شخص شک و ریب میں مبتلا ہو تو اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور اسے راستہ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ اور چونکہ وہ دین اسلام کا بتایا ہوا راستہ قبول کرکے اسے اختیار نہیں کررہا ہے اس لئے وہ اصطلاحاً بھی کفر کی ایک قسم میں گرفتار ہے۔ اسے توبہ کرکے شک و ریب کو اپنے دل سے نکال دینا چاہئے تاکہ اسے نفسیاتی کشمکش سے بھی نجات حاصل ہوجائے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی وہ ایک بندۂ مقبول کا مرتبہ حاصل کرسکے۔

اگر خدانخواستہ کسی کو دین اسلام کے بنیادی عقاید، اللہ، اللہ کے فرشتوں، اللہ کے رسولوں، اللہ کی کتابوں اور قیامت ہی کے بارے میں شک و شبہ پیدا ہوجائے تو یہ مطلق کفر ہے۔ چاہے وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھے اور دنیا والے بھی اسے مسلمان ہی سمجھیں مگر وہ اللہ کے نزدیک مسلمان نہیں ہے۔ اس کو توبہ کرکے اپنے دل و دماغ کی اصلاح کرنی چاہئے۔ لیکن بہت سے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے عقاید میں کوئی شک و ریب نہیں ہوتا، اعمال بھی ان کے برے نہیں ہوتے مگر ان سب خوبیوں کے باوجود وہ مختلف قسم کے اوہام میں مبتلا ہوکر شک و شبہ کی ظلمتوں میں جاپہنچتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب ہیں کہ انہیں وضوء کرتے ہوئے ہمیشہ یہ شبہ لاحق رہتا ہے کہ خدا جانے وضوء صحیح طریقہ پر ہوا یا نہیں، دوسرے صاحب

ھیں کہ ان کو اپنی ہر نماز کے بارے میں یہ شبہ رھتا ھے کہ قبول ھوئی یا نھیں ۔ تیسرے صاحب ھیں کہ ان کو اپنے روزوں، زکوۃ اور حج کے بارے میں یہی شبہ رھتا ھے ۔ ایسے لوگ خود اعتمادی سے محروم رھتے ھیں اور ایمان کامل رکھنے کے بعد بھی کفر کی ظلمت میں گرفتار ھیں ۔ یہ کیفیت موسن کے دل میں نھیں پیدا ھونی چاھئے ۔ ھم نے نماز پڑھی اور اپنے علم و دانش کے مطابق بالکل صحیح پڑھی، اس کی قبولیت میں شک کرنا محض وھم بلکہ اعلی درجہ کی حماقت ھے ۔ ھمیں یقین رکھنا چاھئے کہ ھماری نماز قبول ھوئی اور یقینا قبول ھوئی ۔ اسی طرح دوسرے تمام دینی و دنیوی اعمال کو شک و شبہ سے بالاتر ھوکر انجام دینا چاھئے اور خواہ مخواہ وھم میں مبتلاء ھوکر بے دل نھیں ھونا چاھئے ۔ ورنہ یہ عادت رفتہ رفتہ خدا اور رسول کی صداقت میں شبہ پیدا کرکے ھمیں عذاب الٰھی کا مستوجب بنادے گی ۔

(۲۷) والنیاحة من عمل الجاھلیة اور نوحہ کرنا دور جاھلیت کے کے اعمال میں سے ایک عمل ھے ۔

کسی کی موت پر غمگین ھونا اور بے اختیار آنسو نکل پڑنا نہ صرف تقاضائے فطرت ھے بلکہ علامت ایمان بھی ھے ۔ یہ قابل ملامت نھیں ھے ۔ لیکن سر پر خاک ڈالنا ۔ سوگواری ظاھر کرنے کے لئے خاص قسم کی وضع یا لباس اختیار کرنا، مرنے والے کی خوبیاں بیان کرکرکے بین کرنا یا ایسی مجلسیں منعقد کرنا جو بین کرنے کے لئے ھوں، اسلام سے پہلے عرب کے بت پرستوں میں رائج ایک رسم تھی ۔ اللہ کے سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سخت ناپسندیدہ عمل قرار دیا اور اس سے منع فرمایا ھے ۔ اس جگہ آپ کے فرمان سے مقصود یہ ھے کہ نوحہ گری زمانۂ جاھلیت کے مراسم میں سے ایک رسم ھے ۔ اسلام کے بعد اب اسے جاری نھیں رھنا چاھئے ۔

نوحہ گری کی یہ رسم کافر اقوام میں پہلے بھی سوجود تھی اور اب بھی جاری ھے ۔ یورپ میں عام رواج ھے کہ مرنے والے کے تابوت کو سامنے رکھ کر

ایک دردناک تقریر کی جاتی ہے اور لوگ نوحہ کرتے ہیں ۔ اس قسم کی تقریر کرنے کے لئے اکثر یہ ہوتا ہے۔ کہ پیشہ ور مقرر اجرت پر بلائے جاتے ہیں۔ ہندوؤں میں بھی نوحہ گری کی رسم موجود ہے اور اس کو ایک ضروری رسم قرار دیا جاتا ہے ۔اس رسم کی ادائیگی کے لئے برہمنوں کا ایک پیشہ‌ور گروہ ہوتا ہے جس کو بہت کچھ دے دلا کر رونے اور رلانے کے لئے بلایا جاتا ہے ۔ بعض بستیوں میں کچھ خواتین کا پیشہ ہی یہ ہوتا ہے کہ مرنے والے کے گھر جا کر منہ پر آنچل ڈال کر بین کریں ۔ ان کے گھر والے داد دھش کرکے رخصت کرتے ہیں ۔ اسی طرح ایشیا اور افریقہ کے مظاہر پرست قبائل میں کچھ مرد اور زیادہ تر عورتیں نوحہ گری کرنے کے لئے ایک جگہ جمع ہوتی ہیں اور طرح طرح سے بین کرکے روتی اور رلاتی ہیں ۔ اس کام کے لئے بعض قوموں مین پیشہ‌ور عورتیں بھی پائی جاتی ہیں ۔ جنھیں اجرت پر بلایا جاتا ہے ۔ بلکہ بعض قبائل میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ اگر مردہ پر نوحہ نہیں کیا گیا تو اس کی روح سارے قبیلہ کو طرح طرح کی آفتوں میں مبتلا کردے گی ۔ بعض یہ سمجھتے ہیں کہ مرنے والے کی روح کو سکون و اطمینان اس وقت تک نہیں حاصل ہوتا جب تک کہ اس کی موت پر ایک مدت معینہ تک نوحہ گری نہ کی جائے ۔

ظاہر ہے کہ اسلام نے حیات و موت سے متعلق جو تعلیمات ہمیں دی ہیں ان سے نوحہ خوانی اور بین کرنے کا جوڑ نہیں مل سکتا ۔ اس لئے آپ نے نوحہ گری کو جاھلیت کی ایک ناپسندیدہ رسم بتا کر اس کی ممانعت فرمادی ۔

(۲۸) والغلول من حر جهنم      اور غلول جہنم کی تپش میں سے ہے

غلول عربی زبان کا ایک مصدر ہے جس کے کئی معانی آتے ہیں ۔ ایک معنی ہے کسی چیز کو چھپا لینا اور اپنے سامان میں ملا دینا ۔ یہاں یہ لفظ مال غنیمت یا کسی اور قسم کے مال متروکہ کو دوسروں کی نظر سے چھپا کر اپنے قبضہ میں کرلینے کے لئے استعمال ہوا ہے ۔ جنگ یا کسی ایسے ہی موقع

پر اس کی بڑی گنجائش رہتی ہے۔ کہ کوئی آدمی گری پڑی چیز کو جلدی سے اٹھا کر اپنے ذاتی سامان میں چھپا لے، دوسروں کو خبر بھی نہ ہونے پائے اور مال اس کے ہاتھ لگ جائے۔

ارشاد نبوی یہ ہے کہ ایسا کرنے والا آدمی یہ سمجھ لے کہ اس گناہ کی لازمی سزا جہنم کا عذاب ہے۔ بہ ظاہر تو یہ مال اچھا ہی نظر آتا ہے مگر درحقیقت یہ جہنم کی تپش اور حرارت کا ایک حصہ ہے، جسے وہ اپنے لئے خود اپنے ہی ارادہ اور سعی سے حاصل کر رہا ہے۔

مال متروکہ پر قبضہ کرنے میں کچھ لوگ جس قدر بیباک ہوتے ہیں، شاید اتنے بے باک وہ اور کہیں ثابت نہیں ہوتے ناجائز طور پر جھوٹے دعوں، اور جھوٹی قسموں کے ذریعہ مال متروکہ کے حاصل کرنے کے لئے لوگ کیا کیا نہ ذہانت اور چالاکی کا ثبوت دیتے ہیں۔ کاش ان بددیانت اور بے یقین لوگوں کو اس کا یقین ہوتا کہ وہ اس طرح کوشش اور محنت کر کے اپنے لئے جہنم کا عذاب اور دوزخ کی تپش حاصل کررہے ہیں۔

(۲۹) والسکر کی من النار　　　　اور نشہ جہنم کی آگ سے داغ ہے

کسی ایسے آدمی کا تصور کیجئے جسے آگ سے داغ دیا جائے، اس کی حالت شدت الم سے کیا ہو جاتی ہے۔ اس کی قوت عقلیہ اس درجہ متاثر ہوجاتی ہے کہ حرکات ارادی کی بجائے غیر ارادی حرکات اس سے صادر ہونے لگتی ہیں۔ چیختا ہے، ہاتھ پیر پٹکتا ہےاور ماہی بے آب کی طرح بے چینی کے ساتھ کروٹیں بدلنے لگتا ہے۔ بالکل یہی حالت اس شخص کی ہوجاتی ہے جس پر نشہ طاری ہو جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ پیر قابو سے باہر ہوجاتے ہیں، لڑکھڑاتا ہے، جھومتا ہے، فضول بکواس کرتا ہے، قوت عقلیہ معطل ہوجاتی ہے، خیر و شر کی تمیز ختم ہوجاتی ہے، قوت فکریہ اپنا کام چھوڑ دیتی ہے، کبھی دیوار سے سر ٹکراتا ہے، کبھی نابدان میں جا لیٹتا ہے، ہنستا ہے تو ہنستا ہی چلا جاتا

ہے، روتا ہے تو بڑی بڑی دیر تک روتا ہی رہتا ہے۔ حالانکہ نہ اس کی کوئی وجہ ہوتی ہے اور نہ اس کی کوئی علت۔

چونکہ سکر یعنی نشہ کی کیفیت داغ زدہ کی کیفیت سے تقریباً مشابہ ہوتی ہے اور اس کی اخروی سزا بھی داغ زدہ کے احساس الم سے مشابہت رکھتی ہے، اس لئے سکر کو جہنم کی آگ سے داغ دیئے جانے کے برابر قرار دیا گیا ہے۔

(۳۰) والشعر من ابلیس اور شعر ابلیس کی طرف سے ہے

شعر کلام موزوں و مقفیٰ کے ذریعہ انسانی احساسات و تاثرات کی ترجمانی کا نام ہے۔ یہ ایک شخص کے انفرادی احساس کا اظہار ہے اور انفرادی احساسات صحیح بھی ہوسکتے ہیں اور غلط بھی۔ اس کی صحت کے لئے کوئی یقینی سند موجود نہیں۔ اس طرح شعر صحیح و غلط کا ایک ممزوج مرکب ہوتا ہے، جس میں اچھی بری اور غلط صحیح، سب ہی طرح کی باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ پھر بیان کرنے کا انداز، تشبیہ و استعارہ کی بہتات کنایہ و ایہام کی کثرت اسے عجیب قسم کا معجون مرکب بنا کر رکھ دیتی ہے۔ رہا مبالغہ اور ایسا مبالغہ جس کی سرحدیں کذب و افتراء اور دروغ بافی سے جا ملتی ہیں۔ تو وہ شعر کو سنجیدہ اور حامل حقیقت قطعی کلام سے الگ ایک چیز بنا دیتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ احسن اوست اکذب اوست یعنی بہترین شعر وہ ہے جو سب سے زیادہ جھوٹ ہو۔

شعر میں چونکہ حق و باطل کا امتزاج ہوتا ہے اس لئے شعر کو شیطانی کارنامہ یا شیطان کی طرف سے الہام قرار دیا گیا ہے، اگر چہ عربی زبان کے جاہلی شعروں میں بعض بعض اشعار بڑے سچے اور مبنی برحق بھی مل جاتے ہیں لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں، باقی سارا کلام فسق و فجور فخر، ناپاک اعمال کی کہانی، اور شخصی و خاندانی غرور کے اظہار پر مشتمل ہے۔ یہی حال دوسری زبانوں کے اشعار کا ہے۔ اپنی زبان اردو کے کسی

دیوان کو اٹھا کر دیکھ لیجئے، چند اشعار اگر صحیح ملیں گے تو سینکڑوں اشعار جھوٹ اور فسق و فجور کی ترجمانی اور کفر و الحاد کی تبلیغ کے نظر آئیں گے ۔ مثلاً اردو کے عظیم الشان شاعر حضرت غالب دھلوی کے اس شعر کو دیکھئے ۔

هم کو معلوم ھے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ھے

اس قسم کے اشعار ہر زبان کے دواوین میں بکثرت ملیں گے ۔ اس لئے بعض بعض اشعار کے صحیح ھونے اور بعض بعض شاعروں کے صاحب ایمان و عمل صالح ھونے کے باوجود شعر کو بہ حیثیت مجموعی اور بہ حکم اکثریت شیطانی الہام بتایا گیا ھے ۔ اس کی اتباع کرکے کوئی آدمی نہ کامیاب و کامران زندگی بسر کرسکتا ھے اور نہ خالق کائنات کی رضا حاصل کرسکتا ھے ۔ رہے وہ اشعار جو صاحب ایمان و عمل صالح حضرات نے کہے ھیں اور ترجمانی حقیقت کی حیثیت رکھتے ھیں وہ اس حکم سے مستثنیٰ ھیں۔

(۳۱) والخمر جماع الاثم — اور شراب سارے ھی گناھوں کا مجموعہ ھے

یہ فقرہ عربی زبان میں بطور ضرب المثل بھی استعمال ھونے لگا ھے ۔ اور حقیقت بھی یہی ھے کہ شراب سارے ھی گناھوں کا مجموعہ ھے ۔ ایک شرابی شراب کے نشہ میں بلکہ شراب کی طلب میں بھی تمام حدود ممنوعہ کو توڑ دیتا ھے ۔ وہ اپنے گھر، خانوادہ اور سارے معاشرے کے لئے عذاب عظیم بن جاتا ھے ۔ شراب حرام ھے ، شراب پینے والا فاسق ھے اور شراب کو حلال سمجھنے والا صاحب ایمان نہیں ھوتا ۔ اللہتعالی نے خمر کو قرآن مجید میں شیطانی عمل اور پلیدگی قرار دے کر اس سے دور رہنے کا حکم دیا ھے ۔ ارشاد ھے :

اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے ھو خمر اور جوا اور بتوں کے استھان اور

اور فال کے تیر، اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ یہ سب پلید اور ناپاک ہیں ۔ شیطان کے کاموں میں سے ہیں، تو ان سے تم دور رہو تاکہ فلاح پاؤ۔ شیطان اس کے سوا کچھ اور نہیں چاہتا کہ خمر اور جوا کے ذریعہ تم میں عداوت و بغض ڈال دے، اور اللہ کی یاد اور نماز سے تم کو روک دے ۔ پس کیا تم اس سے باز نہ آؤ گے؟
(سورۂ المائدہ آیت ۹۰ و ۹۱)

قرآن مجید کا انتہائی شدید انداز بیان یہ ہے کہ باز آنے کو کہے، یہ انداز بیان ''حرام قرار دیا گیا،، کہنے سے زیادہ تاکیدی انداز کا سمجھا جاتا ہے ۔ خمر (شراب) اور جوئے کو بت پرستی کے ساتھ بیان کرنے سے اس کی شدید حرمت کا بیان مقصود ہے ۔ اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ شراب کو حلال سمجھنے والا صاحب ایمان باقی نہیں رہتا ہے ۔

شراب کو سارے ہی گناہوں کا مجموعہ کہا گیا ہے اس کے دو وجوہ ہیں ۔ اول اس شدت طلب کی وجہ سے جو ایک شرابی کو شراب کے لئے لاحق ہوتی ہے اور اس وقت وہ اچھے اور برے کی تمیز سے خالی ہوکر وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جس کو گناہ یا فسوق کہا جاتا ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ شرابی پر جب نشہ طاری ہوتا ہے تو اس کی عقل اپنا کام کرنے سے عاجز ہو جاتی ہے اور وہ کسی بری بات کو بری بات سمجھتا ہی نہیں، اب اس حالت میں جو عمل اس سے سرزد ہوجائے غیر متوقع نہیں ہے ۔

بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ اگر شراب پی کر بھی کوئی آدمی ہوش و حواس سے بے بہرہ نہ ہو جائے اور حقیقت یہ ہے کہ اکثر عادی شراب خوار تھوڑی سی شراب پی کر ہوش و حواس سے بے بہرہ نہیں ہوتے ہیں تو ایسے آدمی کے لئے شراب کی حرمت کم ہوگی یا نہیں ہوگی۔ یہ بڑی شدید غلط فہمی اور حد درجہ کی حماقت ہے ۔ احکام انفرادی نہیں ہوا کرتے بلکہ کلی ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ شراب سے دور رہنے کا حکم دیا

گیا ہے، صرف اس کے نتایج سے بچنے کا حکم نہیں ہے۔ نتایج پیدا ہوں یا نہ ہوں اس سے حکم کا کوئی براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوا کرتا۔

مثلاً کسی نے جان بوجھ کر بلا عذر سور کا گوشت کھا لیا اس کے بعد اسے کسی وجہ سے متلی شروع ہوئی اور سارا گوشت قے میں نکل گیا، تو اگرچہ تغذیہ جو لازمی نتیجہ اور مقصود ہےخوراک کا، نہ ہوسکا لیکن وہ شخص حرام کھانے کا مجرم تو بہرحال ہو ہی گیا۔ نتیجہ برآمد نہ ہونے کی وجہ سے فعل کی قباحت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ یا کسی نے زنا کیا اور زنا سے حمل قرار نہ پاسکا تو نتیجہ برآمد نہ ہونے کی وجہ سے فعل زنا کی قباحت اور برائی میں کیا کمی رہ جائے گی۔ یا کسی نے بہ نیت قتل کسی کو گولی ماردی اور گولی نشانہ پر نہ پڑی آدمی بچ گیا تو گولی چلانے والا اقدام قتل کا مجرم ہی ہوگا، بے گناہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔

بالکل اسی طرح اگر کسی نے ایک گھونٹ شراب پی لی یا زیادہ پی، مگر اس پر نشہ اور بدمستی کی کیفیت طاری نہ ہوئی تو اس سے نہ شراب کی حرمت میں کوئی کمی ہوگی اور نہ اس شخص کا جرم ہلکا ہوجائےگا۔ وہ بہرحال مجرم ہے۔ چاہے نتیجہ جرم برآمد ہو یا نہ ہو۔

دوسری غلط فہمی اس سلسلہ میں یہ پیدا کی جاتی ہے کہ خمر نام ہے صرف انگوری شراب کا اس لئے ہر طرح کی شراب یا دیگر مسکرات پر اس کا اطلاق صحیح نہیں ہے۔ یہ محض موشگافی اور نکتہ آفرینی ہے جو رائج ہو گئی ہے۔ اس کی علمی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔ عربی زبان میں مادۂ خمر کے معنی ہیں ڈھانکنے اور چھپانے کے۔ اسی مادہ سے لفظ خمار سر کو چھپانے والی اوڑھنی کے لئے آتا ہے۔ اور اسی سے خمر الشہادۃ گواہی کو چھپانے کے لئے بولا جاتا ہے۔ عربی قوامیس میں جہاں لفظ خمر کے معنی انگوری شراب کے لکھے ہیں وہیں کل مسکر مخامر للعقل (ہر نشہ آور شے جو عقل کو ڈھانک

لئے) بھی لکھا ہوا ہے۔ اس لئے خمر کا اطلاق ہر نشہ آور چیز اور اس کے ہر جزء پر ہوگا۔ چاہے وہ شراب ہو یا تاڑی، چرس ہو یا مدک، بھنگ ہو یا افیون۔ از روئے لغت یہ سب خمر میں داخل ہیں۔ نہ قسم بدلنے سے حکم بدل سکتا ہے اور نہ مقدار کی کمی بیشی سے کوئی فرق پڑسکتا ہے۔

اس طرح خطبہ نبوی میں اس فقرہ سے مقصود یہ ہے کہ ہر نشہ آور چیز گناہوں اور معصیتوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہدایت کی جاتی ہے کہ ایسی چیز کے قریب کبھی نہ جاؤ۔

(۳۲) وشر الماکل مال الیتیم — اور بہت ہی برا کھانا ہے، یتیم کا مال کھانا۔

یتیم کے مال میں صرف وہی مال داخل نہیں ہے جو اس کو وراثۃً ملا ہو بلکہ وہ سب مال داخل ہے جو یتیم کے نام پر سرکار سے یا اہل خیر سے حاصل کیا گیا ہو۔ یہ فقرہ خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کو بار بار پڑھنا چاہئے جو کسی یتیم کے ولی ہوں یا جو یتیم خانوں کے ناظم ہوں۔ خطبہ میں اس فقرہ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مال حرام اور برے طریقہ پر حاصل کی ہوئی غذائیں تو اور بھی بہت سی ہوتی ہیں مگر ان میں ایک نہایت ہی بری غذا وہ ہے جو کسی یتیم کے مال سے بطور ناجایز حاصل کی جائے۔

ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کا مال ناجائز ذریعے سے حاصل کرکے کھا جاتا ہے تو اس مال کا حقیقی مالک اس کو روکنے اور منع کرنے کی کم از کم صلاحیت تو رکھتا ہے لیکن بے چارہ یتیم تو اس کو منع کرنے کی قدرت بھی نہیں رکھتا۔ اس لئے ایسے مال کو شرالماکل یعنی کھانے کی بہت ہی بری چیز قرار دیا گیا ہے۔

(۳۳) والسعید من وعظ بغیرہ — اور سعید (خوش نصیب و کامیاب) وہ ہے جو دوسروں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرلے۔

یعنی وہ شخص سعادتمند اور خوش نصیب ہے جس کو براہ راست نصیحت یا تجربہ کی ضرورت نہ ہو بلکہ دوسروں کو دیکھ کر برائی سے احتراز اور بھلائی کو اختیار کرے۔ "اگلا گرے پچھلا ہوشیار" اگر کوئی شخص اگلے کو لڑکھڑا کر گرتے دیکھے اور اس کے بعد بھی قدم بڑھانے میں ہوشیاری سے کام نہ لے سکے تو اسے کون سعادتمند اور خوش نصیب کہے گا۔

ہم برے اعمال اور بری عادات کے نتایج روز اور ہر جگہ دیکھتے ہیں۔ اپنے عزیزوں اور دوستوں میں دیکھتے ہیں، ہمسایوں اور ہم چشموں میں دیکھتے ہیں، اور کہاں نہیں دیکھتے، کہیں کثرت سے سگریٹ پینے کے نتیجہ میں گلا خراب ہوتے اور پھیپھڑوں کو تباہ ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ کہیں فضول خرچی سے کنبوں کو برباد ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں، کہیں چغلخوروں اور خوشامدیوں کو ذلیل ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ کہیں جھوٹ کی قلعی کھلتی ہوئی نظر آتی ہے، کہیں فریبی اور جعلساز کو گرفتار ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ کیا ان سب کو دیکھ کر بھی اپنے خصائل اور اپنی عادت کو درست کرنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے؟ یاد رکھنا چاہئے کہ اگر ہم خود اپنے آپ کو درست نہیں کرسکتے تو کوئی دوسرا ہمیں سعید و خوش بخت نہیں بنا سکتا۔ جو دوسروں کو دیکھ کر عبرت نہیں حاصل کرتا اس پر نصیحت اور تنبیہ کا اثر شاذونادر ہی ہوتا ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

(۳۴) والشقی من شقی فی بطن امہ — اور بد بخت وہ ہے جو اپنی ماں کے پیٹ ہی میں بدبخت ہوگیا۔

یعنی بدبخت وہ ہے جو شروع ہی سے بدبخت بن گیا ہو۔ عربی زبان میں

انسانی زندگی کے ابتدائی ایام یا ابتدائے غایت کو ظاہر کرنے کے لئے متعدد طریقے ہیں جن میں سے یہ تین زیادہ مستعمل ہیں ۔

(۱) فی بطن امه     اپنی ماں کے پیٹ ہی سے

(۲) منذ لغوبة اطفاره     ناخن پیدا ہونے کے وقت ہی سے

(۳) من نبت شعره     بال اگنے ہی سے

سعید اور شقی دونوں الفاظ ایک دوسرے کی ضد ہیں ۔ یعنی جو سعید نہیں ہے وہ شقی ہے اور جو شقی نہیں ہے وہ سعید ہے ۔ سعید وہ ہے جو دوسروں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرے اور اپنی عادات و خصائل کو درست کرلے اور شقی وہ ہے جو اپنی بری عادت اور ناپسندیدہ خصائل پر قائم رہے ، دوسروں کو دیکھے اور نصیحت نہ حاصل کرے ۔ خطبۂ مبارک کے اس فقرہ میں بتایا گیا ہے کہ شقی وہ ہے جو بالکل ابتدائی وقت ہی سے بری عادات میں گرفتار ہو ۔ اگر اس نے بری عادات و خصائل دوسروں کو دیکھ کر یا کسی اثر کے ماتحت اختیار کرلئے تھے تو یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی وقت اس کے برے نتایج کو دیکھ کر یا کسی نصیحت کے ماتحت اپنی اصلاح بھی کرلے ، لیکن جو ابتداء ہی سے برائی میں مبتلاء ہے وہ بڑی مشکل سے اور شاذونادر ہی اصلاح پذیر ہوتا ہے ۔ عادت خود جبلت بن جاتی ہے ۔ وہ ہر صبح و شام برے اعمال اور بری عادات کے نتایج دیکھتا ہے لیکن عبرت نہیں حاصل کرتا ۔ ایک شرابی اپنے یار میکدہ کو مستی میں سر ٹکراتے ہوئے دیکھتا ہے نابدان میں ساری رات پڑا ہوا پاتا ہے مگر کوئی اثر نہیں لیتا ۔ ایک جواری اپنے رفیقوں کو سارا سرمایہ ہارتے ہوئے دیکھتا ہے ، پولیس کے ہاتھوں ذلیل ہوتے اور ڈنڈے کھاتے ہوئے بھی پاتا ہے لیکن عبرت حاصل نہیں کرتا ۔

یہ لوگ ہیں حقیقی معنوں میں شقی ، بدنصیب اور بدبخت ۔ اب اگر ان میں سے کوئی دوسروں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرلیتا ہے اور توبہ

کرکے اپنی حالت کو درست کرلیتا ہے تو اس کی شقاوت ختم ہوجاتی ہے اور وہ سعید ہوجاتا ہے، ورنہ اسی حالت شقاوت میں مرجاتا ہے ریس اور قمار بازی میں جیتا ہوا روپیہ اور شراب فروشی سے حاصل کی ہوئی دولت یہیں رہ جاتی ہے اور وہ بدبخت عذاب قبر میں مبتلا ہوکر تڑپتا رہتا ہے جہاں نہ اصلاح حال کا وقت ہوتا ہے اور نہ توبہ کے لئے کوئی موقع۔

| | |
|---|---|
| (۳۵) وانما یصیر احدکم الی موضع اربعة اذرع والامر الی الاخرة | اور تم میں سے ہر شخص بالآخر چار ہاتھ زمین ہی تک پہنچتا ہے اور معاملہ آخرت کے سپرد ہو جاتا ہے |

رفتم بہ سر تربت محمود غنی  پرسیدم کہ چہ بردئی ز دنیاے دنی
گفتا کہ دوگز زمیں و شش گز کرپاس  تو نیز ہمی بری اگر صد چو منی

(میں محمود غنی کی قبر پر پہنچا تو میں نے پوچھا کہ اس ذلیل دنیا سے آپ کیا لے جا سکے انھوں نے جواب دیا کہ دو گز زمین اور چھ گز کپڑا اور تم بھی یہی کچھ لے جاؤ گے چاہے مجھ سے سوگنا دولت و حشمت تمہیں حاصل ہو۔)

اور یہ بھی تو عام حالات کی طرف اشارہ ہے۔ دو گز زمین اور چھ گز کپڑا بھی سب کو کہاں میسر آتا ہے ہزاروں دریاؤں میں ڈوب کر لاپتہ ہوجاتے ہیں اور سینکڑوں جنگلی درندوں کی غذا بن جاتے ہیں۔ اور جنھیں اس دنیائے دنی سے چھ گز کپڑا دے کر دو گز زمین میں چھپا دیا جاتا ہے انھیں بھی یہ کپڑا اور زمین وہاں کیا کام آتی ہے۔

بے بس و تنہا پڑے ناچار جا کر گور میں
کچھ نہ ان کے ساتھ دنیا سے گیا الا عمل

| | |
|---|---|
| (۳۶) وملاک العمل خواتمه | اور عمل کی حقیقت اس کے آخری حصے ہوتے ہیں۔ |

عربی زبان میں لفظ ملاك کے متعدد معانی ہیں ۔ ایک ضرب المثل ہے القلب ملاك الجسد (دل بدن پر اقتدار رکھتا ہے) اسی طرح جانوروں کے پاؤں جن پر ایک چوپایہ کھڑا ہوتا ہے، انہیں ملاك الدابة کہا جاتا ہے ۔ اسی طرح اس مٹی کو بھی جس سے کمہار برتن بنا تا ہے ملاك کہتے ہیں ۔

یہاں اس فقرہ کے معنی یہ ہیں کہ عمل کے معاملہ میں اعتبار کسی عمل کے آخری حصوں کا ہوگا، اوائل و اواسط کا نہیں ہوگا ۔ مثلاً ایک شخص جہاد کے لئے گھر سے نکلا مگر مقصود یہ تھا کہ اس طرح اس کی شجاعت کا سکہ بیٹھ جائے گا ۔ لیکن میدان جہاد میں پہنچ کر اس کی نیت بدل گئی اور اب اس کے سامنے رضائے الٰہی کے سوا کچھ باقی نہ رہا تو اس کا جہاد مقبول بارگاہ خداوندی ہوگا ۔ اس کے عمل کے آخری حصہ میں جو اس کا مقصود تھا وہی اس کے عمل کی حقیقت قرار پائے گا ۔

ایک دوسری مثال لیجئے ایک آدمی نے کسی یتیم لڑکی کی پرورش و پرداخت کا ذمہ لیا اور صرف رضائے الٰہی کو مقصود بنا کر اس کی پرورش کی مگر جب لڑکی جوان ہوئی تو اس نے لڑکی کو فروخت کردیا یا بدکاری میں لگا دیا تو اس کے پچھلے اعمال پرورش و پرداخت کا کوئی اعتبار نہ ہوگا ۔ وہ خدا اور قانون دونوں کی نظر میں ایک مستوجب سزا مجرم ہی ہوگا ۔ بلکہ اس کا بھی خطرہ ہے کہ آخرت میں اس کے پچھلے اعمال نیک بھی گناہ قرار پائیں ۔

ایک مفہوم اس فقرہ کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عمل کرنے والے کا جس عمل پر خاتمہ ہوا ہے، اس کا اعتبار ہوگا ۔ اگرچہ یہ بات دوسرے احکام کے اعتبار سے صحیح ہے مگر اس فقرہ سے یہ مفہوم لینا دور از کار تاویل ہوگی ۔

(۳۷) و شر الرویا الکذب ۔ اور بہت ہی برا خواب ہے جھوٹا خواب

خواب کی حقیقت پر اگر امام ابن سیرین، عبدالغنی نابلسی اور جدید علماء

نفسیات فرائڈ وایڈلر وغیرہ کے اقوال کو سامنے رکھ کر بحث کی جائے تو بات بڑی طولانی ہو جائے گی اور حقیقۃً اس کی یہاں ضرورت بھی نہیں ہے ۔ آدمی جو کچھ نیند میں دیکھتا ہے اسے خواب کہتے ہیں ۔ اس کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں ، خوشخبری یا بشارت، تخویف، اور تحدیث نفسی وغیرہ وغیرہ ۔

اس فقرہ میں خواب کی حقیقت یا اس کی قسموں کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا ہے ۔ اس میں ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو محض جھوٹے خواب بنا کر بیان کرتے ہیں حالانکہ انھوں نے نیند میں کچھ بھی نہیں دیکھا ہے ۔ ایسے لوگ ہر زمانہ اور ہر ملک میں ہوتے ہیں جو اپنی بزرگی جتانے اور اپنے آپ کو صاحب باطن ظاہر کرنے کے لئے جھوٹے خواب تصنیف فرمایا کرتے ہیں ۔ اگر کہیں اتفاقاً ان کا یہ جھوٹ کسی شکل میں سچ ہوکر ظاہر ہوگیا تو پھر اپنی بزرگی اور روشن ضمیری کا اشتہار دیتے ہیں ۔ اور اگر یہ جھوٹ جھوٹ ہی رہا کچھ بھی ظاہر نہ ہوا تو پھر طرح طرح کی دور از قیاس و وہم تاویلیں کرکے لوگوں کو مطمئن کرنے کی سعی کرتے ہیں ۔

ہمارے اس زمانہ میں بھی ایسے حضرات کی کوئی کمی نہیں ہے ۔ بعضوں نے تو جھوٹے خوابوں کے ذریعہ صرف اپنی بزرگی اور صفائی باطن ثابت کرنے ہی پر اکتفاء کی ہے اور بعض حوصلہ مند تو اس طرح کی ابلہ فریبی سے اپنی مہدویت اور نبوت تک ثابت کر لیتے ہیں ۔ حالانکہ جھوٹے خواب تو جھوٹے ہی ہیں ۔ خواب اگر سچا بھی ہو تو کوئی قابل اعتماد ذریعہ علم نہیں ، نہ شریعت میں قابل قبول ہے ، نہ قانون میں نہ تجربہ اس کی تصدیق کرتا ہے اور نہ عقل سلیم ۔

(۳۸) وکل ماھوآت قریب — اور جو کچھ آنے والا ہے وہ قریب ہے

یہ ایک کلیہ ہے کہ جو وقت آنے والا ہی ہے اسے قریب ہی سمجھ کر اس کے لئے تیار ہوجانا دانائی ہے ۔ اور اسے بعید سمجھ کر غافل رہنا حد درجہ

کی نادانی۔ مثلاً یہ سب کو معلوم ہے کہ بارشوں کے دن آئیں گے، اگر کسی نے بارش کو بہت دور سمجھ کر اپنی ٹوٹی ہوئی چھت کو درست کرنے سے غفلت برتی تو کوئی دانائی کا کام نہیں کیا۔ ایک دن یکایک بارش آجائے گی اور اسے بڑی تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ اسی طرح سردی، گرمی، دن، رات کے آنے پر غور کر لیجئے۔

اگر دنیا کا یہی حال ہے تو اس بے عقل اور احمق کی حالت کس قدر قابل رحم ہے جو موت جیسی یقینی بات کو قریب نہ سمجھے، غفلت میں پڑا رہے اور اس کے لئے کوئی تیاری نہ کرے۔ اس فقرہ میں موت اور ما بعد الموت کی طرف اشارہ ہے۔ ہماری حماقت و نادانی بھی کس درجہ کی نادانی ہے۔ روزانہ لوگوں کو مرتے دیکھتے ہیں، اور یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ یہ وقت ہم پر بھی آنے والا ہے اور ضرور آنے والا ہے۔ لیکن حماقت سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہماری موت بہت دور ہے، قریب نہیں ہے اس نادانی سے غفلت پیدا ہوگئی ہے اور موت و مابعد الموت کی طرف سے ہم خود فراموشی میں مبتلاء ہیں۔ سب طرح کے سامان کرتے ہیں مگر موت اور قیامت کے لئے کچھ نہیں کرتے۔

آگاہ اپنے حال سے کوئی بشر نہیں ۔ سامان سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں

| | |
|---|---|
| (۳۹) وسباب المومن فسوق | کسی صاحب ایمان کو گالی دینا فسق ہے |
| (۴۰) وقتاله کفر | اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے |
| (۴۱) واکل لحمه من معصیةالله | اور اس کا گوشت کھانا (غیبت کرنا) اللہ تعالی کی نافرمانیوں میں سے ہے |
| (۴۲) وحرمة ماله کحرمة دمه | اور اس کے مال کی حرمت اس کے |

خون کی حرمت کے برابر ہے (یعنی
اسے بغیر حق قتل کرنا جایز نہیں
تو بغیر حق اس کا مال لینا بھی
جائز نہیں ہے)

ان چاروں فقروں کا تعلق ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنے اور خوشگوار زندگی بسر کرنے سے ہے اس لئے ایک ساتھ ہی انہیں نقل کردیا ہے۔

ان چار فقروں میں چار بری باتوں کے خلاف تنبیہ کی گئی ہے۔

(۱) سباب۔ یعنی گالی دینا

(۲) قتال۔ یعنی جنگ کرنا (ایک کا دوسرے کو قتل کرنے کی کوشش کرنا)

(۳) غیبت کرنا (آدمی کا گوشت کھانا کسی کی غیبت کرنے کو کہا جاتا ہے)

(۴) ناجائز طور پر کسی کے مال پر قبضہ کرلینا۔

ارشاد نبوی میں مومن کا لفظ ان بری باتوں میں برائی کی شدت ظاہر کرنے کے لئے آیا ہے۔ جیسے ہم اپنے کسی بچہ کو کہتے ہیں کہ اپنی چھوٹی بہن کو مارو نہیں، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جو تمہاری بہن نہیں ہے اسے مارو۔ فعل کی برائی کو شدید ظاہر کرنے کے لئے اپنی چھوٹی بہن کا اضافہ کردیا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح مندرجہ بالا فقروں میں برائی کی شدت ظاہر کرنے کے لئے المومن کا لفظ آیا ہے۔ ورنہ کافر کو بھی گالی دینا، اس سے ناحق جنگ و قتال کرنا، اس کی غیبت کرنا، یا اس کے مال پر ناجائز قبضہ کرنا گناہ ہے اور اس کو اسلامی شریعت میں جرم قرار دیا گیا ہے۔

ان چاروں فقروں کو یاد کرکے جب ہم اپنی زندگی کو دیکھتے ہیں۔

تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہمارا کوئی رشتہ تعلیمات نبوی سے اب باقی نہیں رہ گیا ہے ۔ ہم ان چاروں برائیوں میں بری طرح مبتلاء ہیں ۔

(۴۳) ومن یتالی علی اللہ یکذبہ — اور جو اللہ کی قسم کھاتا ہے اللہ اس اس کو جھٹلا دیتا ہے

قسم کا مطلب یہ ہے کہ قسم کھانے والا اپنے قول کی صداقت پر اللہ تعالی کو شاہد قرار دیتا ہے ۔ جب کسی خاص موقع پر اس کی ضرورت ہی لاحق ہو تو قسم کھائی جا سکتی ہے لیکن بعض لوگ بے ضرورت اور بے فائدہ قسم کھاتے رہتے ہیں ۔ اور چونکہ وہ ہمیشہ قسم کھایا کرتے ہیں اس لئے اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قسم میں جھوٹے بھی ثابت ہوتے ہیں ۔ خصوصاً وہ لوگ اکثر جھوٹے ثابت ہوتے ہیں جو مستقبل کے معاملات میں قسم کھالیتے ہیں ۔ کیونکہ مستقبل کی صورت کیا ہوگی یہ کسی کو معلوم نہیں ۔ اکثر ایسے حالات پیش آجاتے ہیں کہ قسم کھانے والا پوری کوشش کے باوجود جھوٹا ثابت ہوتا ہے ۔ اس لئے احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ماضی کے معاملہ پر بھی بغیر شدید ضرورت کے قسم نہ کھائی جائے ۔ اور مستقبل کے متعلق تو کبھی کوئی قسم نہیں کھانی چاہئے کہ اس میں جھوٹے ثابت ہونے کے شدید خطرات کے علاوہ اور بہت سے گناہوں کی گنجایش موجود ہے، مثلاً وعدہ خلافی، رسوائی وغیرہ ۔

(۴۴) و من یغفر یغفرلہ — اور جو بخش دیتا ہے اسے بخش دیا جائے گا ۔

(۴۵) و من یعف یعف اللہ عنہ — اور جو معاف کردیتا ہے، اللہ تعالی اسے معاف کردے گا ۔

(۴۶) ومن یکظم الغیظ یاجرہ اللہ — اور جو غصہ پی جاتا ہے اللہ تعالی اسے اجر دے گا

(۴۷) و من يصبر على الزريه يعوضه الله — اور جو حق تلفی پر صبر کرتا ہے اللہ تعالی اسے معاوضہ دے گا

(۴۸) و من يتبع السمعة يسمعه الله — اور جو شہرت کے پیچھے پڑجاتا ہے اللہ تعالی اس کو بدنام کر دیتا ہے

(۴۹) و من يتصبر يضعف الله له — اور جو بمقابلۂ نقصان ثابت قدم رہتا ہے اللہ تعالی اس کو دوگونہ عطا فرماتا ہے

(۵۰) و من يعص الله يعذبه — اور جو اللہ تعالی کی نافرمانی کرتا ہے اللہ اس کو عذاب میں ڈالے گا

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار استغفراللہ کہا اور خطبہ ختم کردیا

یہ ساتوں، آخری فقرات کو ایک ساتھ ہی لکھ دیا گیا تاکہ ایک ساتھ ان کی مختصر تشریح کردی جائے۔ لیکن بہتر ہوگا کہ ان سات فقروں پر غور کرنے سے پہلے حسب ذیل سطور پر بھی غور کرلیا جائے تاکہ ان سے صحیح فائدہ اٹھایا جا سکے۔

انسانی زندگی ایک غیر منقطع تسلسل کے ساتھ ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ میں داخل ہوتی ہوئی مقام لازوال تک پہنچے گی۔ یہ موت کے ساتھ ختم نہیں ہوجاتی ہے اور نہ پیدائش سے شروع ہوتی ہے اس کی ابتداء اس وقت ہوئی تھی جب کہ اللہ تعالی نے حضرت آدم کو پیدا کیا تھا۔ اور ان کی ساری اولاد کو حاضر کرکے الست بربکم (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) کا سوال کیا تھا۔ اور سب نے اللہ تعالی کی ربوبیت کا اقرار کیا تھا۔ اب اس

کے بعد سے اس دنیا میں پیدا ہونے تک انسان جس عالم میں رہتا ہے، اسے مختلف لوگوں نے مختلف نام عطا کئے ہیں۔ بعض اسے عالم مثال سے موسوم کرتے ہیں اور بعض اسے عالم اقرار یا مرحلۂ اول قرار دیتے ہیں ۔ دوسرا عالم یہ دنیا ہے جہاں انسان پیدائش کے ذریعہ تدریجی طور پر داخل ہوتا ہے، یہ عالم شہادت یا عالم تخلیق یعنی مرحلۂ دوم ہوا۔ تیسرا عالم برزخ ہے جہاں انسان موت کے ذریعے تدریجی طور پر داخل ہوتا ہے۔ یہ عالم برزخ یا عالم حجاب کہلاتا ہے۔ یہ مرحلہ سوم ہوا ۔ چوتھا عالم عالم قیامت ہے جہاں سارے ہی انسان بہ یک وقت داخل ہوجائیں گے ۔ بالکل اسی طرح جیسے مرحلۂ اول میں سارے ہی انسان بہ یک وقت پیدا کردئے گئے تھے ۔ یہ مرحلۂ چہارم ہے، اور یہ مقام لازوال ہے۔ جنت یا دوزخ میں کسی کو موت نہیں آئے گی اور نہ اس عالم سے کسی دوسرے عالم میں منتقل ہونا پڑے گا۔

ان چاروں عوالم یعنی مثال، شہادت، برزخ اور قیامت میں انسان کی کیفیت اور اس کے قوی مختلف ہوتے ہیں ۔ اس لئے ان چاروں عوالم میں انسان کے کام اور زندگی کے اعمل بھی مختلف ہوتے ہیں ۔ یہ صحیح نہیں ہوگا کہ ہم اپنی موجودہ یعنی عالم شہادت کی زندگی پر باقی تین مرحلوں کو قیاس کرلیں ۔ بلکہ صحیح طریقہ ان کے معلوم کرنے کا یہ ہے کہ خدا نے جس کو خبر دی ہو، اس سے پوچھیں۔ یہی طریقہ فطری اور حقیقی ہے۔

ہر شخص خود اپنی ذات پر اچھی طرح غور کرے، یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی کہ ہمارے پاس علم کے ذرایع صرف تین ہیں اول خبر، دوم استدلال، سوم مشاہدہ۔ ان میں سے سب سے زیادہ وسیع ذریعہ علم خبر ہے۔ ہم جو کچھ جانتے ہیں اس کا تقریباً ۹۳ فیصد خبر کے ذریعہ حاصل شدہ علم ہے۔ ماں باپ کی دی ہوئی خبریں، استاذ اور احباب کی دی ہوئی خبریں، ڈاکٹروں عالموں اور ماہرین کی دی ہوئی خبریں ہی وہ ذرایع ہیں جن میں سے ہم

رشتوں ناطوں کا، علوم و فنون کا، صحت و سقم کا اور عام حالات کا علم حاصل کرتے ہیں ۔ ہمارے دلوں میں اس طرح حاصل شدہ علم سے یقین پیدا ہوتا ہے اور ہم اسی پر زندگی بسر کرتے ہیں ۔ ماں باپ کی دی ہوئی خبروں پر یقین رکھتے ہیں ۔ بھائی کو بھائی، بہن کو بہن اور چچا کو چچا مانتے ہیں ۔ اس بارے میں ہمارا یقین اتنا محکم ہوتا ہے کہ شک اس کے قریب نہیں آتا ۔ اسی طرح اساتذہ کی دی ہوئی خبروں، ڈاکٹروں اور عالموں کی دی ہوئی خبروں سے بھی ہمیں علم اور یقین حاصل ہوجاتا ہے ۔

اگر عملی زندگی میں ہمارا یہی حال ہے اور یقیناً یہی حال ہے تو یہ کتنی بڑی حماقت ہوگی کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی خبروں سے علم اور یقین حاصل نہ کرسکیں حالانکہ وہ انسانی اعمال اور اس کے اخروی نتایج کی جو خبر دیتے ہیں وہ انہیں نہ صرف وحی الٰہی کے ذریعہ حاصل ہوئی ہے بلکہ معراج میں اللہ تعالی نے ان کو اس کا مشاہدہ بھی کرا دیا ہے تاکہ وہ عینی شاهد کی حیثیت سے دنیا کو خبر دیں ۔ اور ان کے صادق امین ہونے کا اقرار دوست تو دوست ان کے شدید دشمنوں نے بھی ہمیشہ کیا ہے ۔ اب اس شخص کی حماقت و نادانی کو کیا کہئے جو کسی ڈاکٹر کے کہنے سے زہریلی اور تلخ دوا تو کھا لیتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ یہ دوا اس کے لئے مفید ثابت ہوگی مگر اللہ کے سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تعمیل میں عمل صالح نہیں اختیار کرتا ۔ اور اسے اس کا یقین نہیں حاصل ہوتا کہ یہ عمل اس کے لئے دنیا اور آخرت میں دونوں جگہ مفید ثابت ہوگا ۔

یہ یقین پیدا ہونے کے بعد کہ یہ قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے جنھیں نتایج اعمال کی اطلاع نہ صرف بذریعہ وحی و نبوت دی گئی ہے بلکہ آپ نے ان نتایج کا مشاہدہ شب معراج میں خود اپنی آنکھوں سے بھی کیا ہے

اور جن کی صداقت پر دوست، دشمن بلکہ آسمان و زمین گواہ ھیں ۔ اب مندرجہ بالا ساتوں فقروں پر غور کیجئے ۔

(۱) پہلے فقرہ میں خبر دی گئی ھے کہ جو دوسروں کے قصور کو بخش دیتا ھے اللہ تعالی اس کے قصور کو بھی بخش دے گا ۔ عربی زبان میں غفر کے معنی ھیں چھپا دینا اور سزا سے بری کردینا ۔ اسے ھم اردو میں بخش دینے سے ادا کرتے ھیں ۔ اگر ھم لوگوں کی کوتاھیوں اور قصوروں کو چھپادیں اور ان کو سزا دینے کے پیچھے نہ پڑجائیں تو ھمیں اللہ تعالی کی طرف سے اس دنیا میں بھی اور قیامت کے دن بھی یہ صلہ ملے گا کہ ھمارے قصوروں کو بھی اللہ غفور و رحیم چھپا دے گا اور ھمیں سزا سے بری کردے گا ۔ ذرا خود اپنی حالت پر غور کریں ،ھم دوسروں کے قصور کا اعلان کرنے اور اس کو سزا دینے کے لئے تو ھمیشہ ھی تیار رھتے ھیں ۔ لیکن کبھی یہ نہیں دیکھتے کہ خود ھم بھی تو قصوروار ھیں، اگر ھمارے ساتھ بھی ایسا ھی معاملہ دنیا و آخرت میں کیا جائے تو ھمارا کیا حال ھوگا ۔

(۲) دوسرے فقرہ میں خبر دی گئی ھے کہ جو معاف کردیتا ھے، اللہ تعالی اسے معاف کردے گا ۔ عربی میں عفو کے متعدد و متضاد معنی ھیں ۔ ان میں سے ایک معنی ھے نشان کا مٹا دینا ۔ یہاں یہی معنی مقصود ھے ۔ اگر کوئی شخص دوسرے کے ساتھ یہ سلوک کرے گا کہ اس کی خطا کا نشان مٹا دے تو اللہ تعالی بھی اس کی خطاؤں کے اثرات کو مٹا دے گا ۔

(۳) تیسرے فقرہ میں خبر دی گئی ھے کہ جو شخص اپنے غصہ کو پی جاتا ھے، اللہ تعالی اس کو اس عمل صالح کا اجر یعنی مزدوری عطا فرمائے گا ۔ گویا یہ عمل اللہ کی ھدایت پر ایک عبادت ھوئی اور اللہ تعالی کے نزدیک اپنے غصہ پر قابو رکھنے والا اور غصہ کو پی جانے والا مستحق اجر قرار پایا ۔ اللہ تعالی اس عامل کو کیا اجر عطا فرمائے گا ۔ اس کا اندازہ کون لگا سکتا ھے ۔

قرآن مجید کی ایک آیت میں غصہ کو پی جانے والے اور قصور معاف کردینے والے کو اللہ تعالی نے محسن (احسان کرنے والا نیکوکار) قرار دے کر اپنی پسندیدگی اور محبت کا مقام عطا فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

| | |
|---|---|
| الذین ینفقون فی السراء والضراء والکاظمین الغیظ و العافین عن الناس واللہ یحب المحسنین (آیت نمبر ۱۳۴ سورۂ آل عمران) | ایسے لوگ جو خرچ کرتے ہیں، فراغت میں اور تنگی میں اور غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کردینے والے ۔ اور اللہ تعالی احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ |

قادر مطلق جس کے قبضہ میں سب کچھ ہے جس شخص کو پسند کرے گا اور اس سے محبت فرمائے گا تو اسے کیا کچھ نعمتیں عطا کرے گا، اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔

(۴) چوتھے فقرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خوشخبری دی ہے کہ جو شخص حق تلفی پر صبر کرلیتا ہے اللہ تعالی اس کو اپنی طرف سے معاوضہ دے گا۔ عدل و انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو اللہ کی طرف سے معاوضہ ملے اور اس کے حق سے بہت زیادہ ملے۔

(۵) پانچویں فقرہ میں یہ تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ جو شخص اپنی شہرت و ناموری کے پیچھے لگا رہتا ہے، اللہ تعالی اسے رسوا اور بدنام کردیتا ہے۔ اس فقرہ میں غور کرنے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ شہرت کی خواہش اگرچہ اپنی جگہ پر ایک بری خواہش ہے لیکن رسوائی اور بدنامی سزا ہے شہرت طلبی اور اس کے پیچھے لگ جانے کی، شہرت کی خواہش کی نہیں ہے۔

آدمی شہرت طلبی کے پیچھے پڑ کر کس طرح اپنی زندگی کو برباد کرتا ہے، اس کے نمونے آپ کو اپنے معاصرین اور خصوصیت کے ساتھ پیشوائی

و قیادت کے دعویداروں میں بہ کثرت مل جائیں گے۔ یہ دون فطرت اور کمینے مرشدین، مقتدایان اور قائدین ہر وقت اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ انہیں شہرت حاصل ہو۔ ان کی ذہنیتیں اس قدر پست ہوجاتی ہیں کہ ان کے اقوال کا معیار عوام کی طرف سے پسندیدگی اور ناپسندیدگی بن جاتا ہے۔ وہ اپنے کسی قول یا عمل سے پہلے یہ کبھی نہیں سوچتے کہ اللہ تعالی کی رضا بھی اس میں ہے یا نہیں ہے بلکہ وہ یہ سوچتے ہیں کہ عوام اسے پسند کریں گے یا نا پسند۔ اس طرح وہ اللہ کے خوف سے روز بہ روز عاری ہوتے رہتے ہیں اور ان کے قلوب غیر اللہ بلکہ بندوں کے خوف سے بھرتے جاتے ہیں۔ یہ لوگ قیامت کے دن حساب کا خیال دل سے محو کرکے اس کی جگہ انتخاب کے دن کو دے دیتے ہیں۔ وہ نیکی کے بیسوں کام کرتے ہیں لیکن ان سے مقصود اللہ تعالی کی رضا نہیں بلکہ اپنی شہرت و ناموری ہوتی ہے۔

شہرت کی خواہش آدمی کی ایک ذہنی کمزوری ہے لیکن شہرت طلبی کے پیچھے لگ جانا تو اکثر صورتوں میں آدمی کو نفاق کے پست مقام تک پہنچا دیتا ہے۔ اللہ تعالی کی طرف سے اس کی سزا رسوائی اور بدنامی مقرر ہے، بہت سے لوگوں کو تو اسی دنیا میں رسوائی اور بدنامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ دنیا بڑی بے وفا ہے، اس نے کسی سے وفا نہیں کی ہے۔ اور بعض وہ شہرت طلب لوگ ہوتے ہیں جن کی رسوائی و بدنامی کا دور شروع ہونے سے پہلے ہی موت آکر ان کی بساط شہرت کو الٹ دیتی ہے۔ بہرحال ان دونوں اقسام کے طالبان شہرت کو قیامت کے بھرے میدان میں رسوائی و بدنامی کی سزا سے گذرنا ہی پڑے گا۔ اس لئے کہ طلب شہرت کے پیچھے لگ جانے والوں کی سزا اللہ تعالی کی طرف سے یہی مقرر ہے

اے هنرها نهاده برکف دست عیب ها را نهفته زیر بغل

لوگوں کا بھی عجیب حال ہے ہتیلی پر رکھ کر اپنے ہنر دکھاتے پھرتے ہیں اور اپنے عیب کو بغل میں چھپائے رہتے ہیں۔

(٦) چھٹے فقروں میں بتایا گیا ہے۔ کہ جو شخص اپنے کسی نقصان پر صبر کرتا ہے، یعنی اس پر واویلا نہیں کرتا، دل پر جبر کرکے برداشت کرلیتا ہے خدا کا شکوہ نہیں کرتا تو اللہ تعالی اسے ضایع شدہ نعمت سے دوگونہ نعمت عطا فرماتا ہے۔ یہ ہماری بڑی کمزوری اور ناشکری ہے کہ اپنے ذرا سے نقصان پر واویلا کرنے لگتے ہیں اور خدا کا شکوہ اس طرح کرتے ہیں جیسے خدا نے کبھی ہمیں کچھ نہ دیا ہو۔ اب تک جو جو نعمتیں خدا نے عطا فرمائی ہیں، سب کو بالائے طاق رکھ کر ذرا سے نقصان پر اللہ تعالی کی شکایت کرنا بڑی کم ظرفی اور احسان فراموشی ہے۔ ایک بندۂ مومن کو ایسے مواقع پر صبر اختیار کرنے سے دو فائدے حاصل ہوتے ہیں، ایک تو یہی کہ اللہ تعالی اس کو دوگونا عطا فرماتا ہے اور دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ اسے دلی سکون و اطمینان کی نعمت حاصل ہوجاتی ہے۔ پھر یہ بندۂ مومن اللہ کی رضا کے اس مقام پر فائز ہو جاتا ہے جس کے بارے میں قرآن مجید میں ہے۔

| | |
|---|---|
| رضی اللہ عنہم و رضواعنہ | اللہ تعالی ان سے راضی ہوگیا اور |
| (آیت نمبر ٨ سورۃ البینۃ) | اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے |

(٧) ساتویں اور آخری فقرہ میں ایک ساتھ ہی تنبیہ بھی ہے اور بشارت بھی۔ تنبیہ یہ ہے کہ اللہ تعالی کی نافرمانی کرکے یہ سمجھنا کہ اس کے عذاب سے چھوٹ جائیں گے۔ صحیح نہیں۔ البتہ بھول چوک، بے خیالی اور غفلت سے جو قصور سرزد ہو جائے وہ توبہ و ندامت سے معاف ہوجائے گا اور اللہ تعالی اس پر عذاب نہیں دے گا۔ شاید یہی بات سمجھانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آخری فقرہ پر خطبہ کو ختم فرماتے ہوئے تین بار استغفراللہ کہا۔ جن کو اگلے پچھلے سارے ہی گناہوں کے بخشش دئے جانے کی خبر دی جاچکی تھی، ان کا بہ کثرت استغفراللہ کہنا اور بخشش کی دعا کرنا تعلیم و تاکید کے سوا اور کس مقصد کے لئے ہوسکتا ہے؟

---

حوالہ : اصل خطبہ تبوک

زادالمعاد فی ھدی خیر العباد مصنفہ امام شمس‌الدین محمد بن ابی بکر ابن قیم الجوزیہ " المتوفی ٧٥١ھ مطبوعہ المطبعۃ " المیمنیۃ، القاہرہ، ١٣٢٤ھ ج ٢ ص ٧۔

# خطبۂ تبوک

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبۂ مبارک
بمقام تبوک ۔ غزوۂ تبوک رجب ۹ھ)

ترجمہ از

سید عبد القدوس ہاشمی

---

ادارہ تحقیقات اسلامی

اسلام آباد